سعادت حسن منٹو

کالی شلوار

اچھی
کتابیں
آپ
کے
قیمتی
ذہن
کی
نشوونما
کرتی
ہیں

کالی شلوار

سعادت حسن منٹو

معاون ناشر و تقسیم کار

انتخابِ ادب ۔ ۱۰۔ ایبٹ روڈ انار کلی لاہور

ناشر ——— ظفر احمد قریشی

معاون ناشر و تقسیم کار ——— بلیغ الدین جاوید

تعداد ——— ایکہزار

تاریخ اشاعت ——— ۱۹۷۵ء

سرورق ——— بشارت

ناشر

ظفر احمد قریشی اینڈ سنز لاہور

معاون ناشر و تقسیم کار

انتخاب ادب ۱۰- ایبک روڈ انار کلی لاہور

(تاج پریس لاہور)

فہرست

سجدہ

گلاس سے پر بوتل جھکی تو ایک دم حمید کی طبیعت پر بوجھ سا پڑ گیا - ملک جو اس کے سامنے تیسرا پیگ پی رہا تھا فوراً تاڑ گیا کہ حمید کے اندر دہاتی کشمکش پیدا ہو گئی ہے وہ حمید کو سات برس سے جانتا تھا اور ان سات برسوں میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے، جن کا مطلب اس کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا تھا --- لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ اس کے لاغر دوست کے سینے پر کوئی بوجھ جس کا اثر شراب پینے کے دوران میں کبھی کبھی حمید کے اندر یوں پیدا ہوتا ہے کہ جیسے بے دھیان بیٹھے ہوئے آدمی کی پسلیوں میں کوئی زور سے ٹھوکا دیدے ---

حمید بڑا خوش باش انسان تھا، ہنسی مذاق کا عادی، حاضر جواب، بذلہ سنج اس میں بہت سی خوبیاں تھیں - مثال کے طور پر سب سے بڑی خوبی یہ تھی - کہ وہ بے حد مخلص تھا - اس قدر مخلص کہ بعض اوقات اس کا اخلاص ملک کے لئے عہد تحقیق کا دماغی افسانہ بن جاتا تھا ---

حمید کے کردار میں ایک عجیب و غریب بات جو ملک نے نوٹ کی تھی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ناآشنا تھیں - یوں تو ملک بھی رونے کے معاملے میں بڑا

بخیل تھا — مگر وہ جانتا تھا کہ جب کبھی رونے کا موقع آئیگا وہ ضرور رو دے گا — اس پرغم افسانہ باتیں اثر ضرور کرتی تھیں — مگر وہ اس اثر کو اتنی دیر اپنے دماغ پر بیٹھنے کی اجازت دیتا تھا جتنی دیر گھوڑا اپنے تنے ہوئے جسم پر مکھی کو —

غموں سے دور رہنے والے اور ہر وقت ہنسی مذاق کے عادی حمید کی زندگی میں نہ جانے ایسا کونسا واقعہ الجھا ہوا تھا — کہ وہ کبھی کبھی قبرستان کی طرح، خاموش ہو جاتا تھا — ایسے لمحات جب اس پر طاری ہوتے تو اس کا چہرہ ایسی رنگت اختیار کر لیتا تھا — جو تین دن کی باسی شراب میں بے جان سوڈا کھولنے سے ہوتی ہے — سات برس کے دوران میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے۔ مگر ملک نے اس کی ان کی وجہ دریافت نہ کی تھی — اس لئے نہیں کہ انکی وجہ دریافت کرنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی، دراصل بات یہ ہے کہ ملک پرلے درجے کا سست اور کاہل ثابت ہوا تھا۔ اس خیال سے بھی وہ حمید کے ساتھ اس معاملے پر بات چیت نہیں کرتا تھا کہ ایک طول طویل کہانی اس سے سننا پڑیگی اور اس کے چوتھے پیگ کا سارا سرور غارت ہو جائیگا۔ شراب پیکر لمبی چوڑی آپ بیتیاں سننا یا سنانا اس کے نزدیک بہت بڑی بدذوقی تھی — اس کے علاوہ کہانیاں سننے کے معاملے میں وہ بہت ہی خام تھا — اسی خیال کی وجہ سے وہ اطمینان سے حمید کی داستان نہیں سن سکے گا، اس نے آج تک اس سے ان دوروں کی بابت دریافت نہیں کیا تھا —

کرپارام نے حمید کے گلاس میں تیسرا پیگ، ڈال کر بوتل میز پر رکھ دی اور ملک سے مخاطب ہو کر بولا "ملک اسے کیا ہو گیا ہے —

ملک خاموش رہا، لیکن حمید مضطرب ہوگیا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب نشہ سے کانپ اٹھے۔ کرپا رام کی طرف دیکھ کر اس نے مسکراہٹ کی کوشش کی اس میں جب ناکامی ہوئی تو اس کا اضطراب اور بھی زیادہ ہوگیا۔

حمید کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ اور اگر چھپانے کی کوشش کرتا تو اس کی وہی حالت ہوتی، جو آندھی میں صرف ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی عورت کی ہوتی ہے۔

ملک نے اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور اس فضا کو جو کچھ عرصہ پہلے حسب منشا باتوں سے گونج رہی تھی۔ اپنی بے محل ہنسی سے خوشگوار بنانے کے لئے اس نے کرپا رام سے مخاطب ہو کر کہا، کرپا تم مان لو، اسے اشوک کمار کا فلمی عشق ہوگیا ہے، بھئی یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے۔ پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سڑا ایل پی رہا ہو۔

کرپا رام، اشوک کمار کو اتنا ہی جانتا تھا کہ مہاراجہ اشوک اور اس کی مشہور آہنی لاٹھ کو فلم اور تاریخ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ وہ ان کے ذائقہ سے عزد آگاہ تھا، کیونکہ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا، مجھے اگر کبھی بے خوابی کا عارضہ لاحق ہو جائے تو یا تو میں فلم دیکھنا شروع کر دوں گا، یا چکرورتی کی لکھی ہوئی تاریخ پڑھنا شروع کر دوں گا، وہ ہمیشہ حساب دان چکرورتی کو مورخ بنا کر اپنی مسرت کے لئے ایک بات پیدا کر لیا کرتا تھا۔

کرپا رام چار پیگ پی چکا تھا۔ پٹیالہ پیگ، نشہ اس کے دماغ کی آخری منزل تک پہنچ چکا تھا۔ آنکھیں سکیڑ کر اس نے حمید کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ

کیمرے کا فوکس کرانا ہے، تمہارا گلاس ابھی تک ویسے کا ویسا پڑا ہے —

حمید نے درد سر کے مریض کی شکل بنا کر کہا: "بس اب مجھ سے زیادہ نہیں پی جاسکے گی"

"تم چند ہو — نہیں چند نہیں کچھ اور ہو — نہیں پینا ہوگی بھیجے یہ گلاس اور اس بوتل میں جتنی پڑی ہے سب کی سب تمہیں پینا ہوگی شراب سے جو انکار کرے وہ انسان نہیں حیوان ہے، حیوان بھی نہیں، اس لئے کہ حیوانوں کو انسان بنا دیا جائے تو وہ بھی اس خوبصورت شے کو کبھی نہ چھوڑیں تم سن رہے ہو — ملک — میں تم اگر یہ ساری شراب اس کے حلق میں نہ اتار دی تو میرا نام کرپارام نہیں گھیسٹارام آرٹسٹ ہے"

گھیسٹارام آرٹسٹ سے کرپارام کو سخت نفرت تھی۔ اس لئے کہ آرٹسٹ ہو کر اس کا نام گھیسٹارام تھا —

ملک کا منہ سوڈا اور وسکی سے بھرا ہوا تھا، کرپارام کی بات سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑا جس کے باعث اس کے منہ سے ایک فوارا سا چھوٹ پڑا، "کرپارام تم خدا کے لئے گھیسٹارام آرٹسٹ کا نام نہ لیا کرو — میری انتڑیوں میں ایک طوفان سا مچ جاتا ہے — لاحول ولا میری پتلون کا ستیاناس ہو گیا ہے — تو بھئی حمید اب تو تمہیں پینا ہی پڑے گی، کرپارام گھیسٹارام بنے یا نہ بنے لیکن میں ضرور کرپارام بن جاؤں گا، اگر تم نے گلاس خالی نہ کیا — لو پیو — پی جاؤ — الٹے منہ کیا دیکھتے ہو — یہ تمہارے چہرے پر قیامت کیسی برس رہی ہے — کرپارام لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے —"

"زبردستی کرنا ہی پڑے گی —"

کرپارام اور ملک دونوں اٹھے اور حمید کو زبردستی پلانے کی کوشش کرنے لگے حمید کو روحانی کوفت تو ویسے ہی محسوس ہو رہی تھی — جب کرپارام اور ملک نے اس کو جھنجھوڑنا شروع کیا تو اس کو جسمانی اذیت پہنچی جس کے باعث وہ بے حد پریشان ہو گیا اس کی پریشانی سے کرپارام اور ملک بہت محظوظ ہوئے اور انہوں نے ایک کھیل سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنا شروع کیا — کرپارام نے گلاس پکڑ کر اس کے سر میں تھوڑی سی شراب ڈال دی اور نائیوں کے انداز میں جب اس نے حمید کا سر سہلایا تو وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے اس کی آواز بھر گئی —— اس کے سارے جسم میں تشنج پیدا ہو گیا اور ایک دم کاندھے ڈھیلے کرکے اس نے رونی اور مردہ آواز میں کہا "میں بیمار ہوں —— خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو"

کرپارام اسے بہانہ سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنے کے لئے کوئی نیا طریقہ سوچنے ہی والا تھا کہ ملک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پرے ہٹا دیا — "کرپا اس کی طبیعت واقعی خراب ہے —— دیکھو تو رو رہا ہے"

کرپارام نے اپنی موٹی گردن کو جھکا کر غور سے دیکھا "ارے تم سچ مچ رو رہے ہو" حمید کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے — جن پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی —

"کیا ہو گیا تمہیں؟ —— خیر تو ہے؟"

"پر تم کیوں رو رہے ہو —"

"بھئی حد ہو گئی —— ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے —"

"کچھ سمجھ بھی تو تمہیں کیا تکلیف — ہے تمہیں ؟"

ملک اس کے پاس بیٹھ گیا — "بھئی مجھے معاف کر دو، اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو —"

حمید نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا جذبات کی شدت کے باعث اس کی قوت گویائی جواب دے گئی تھی —

تیسرے پیگ سے پہلے اس کا چہرہ پر رونق تھی اس کی باتیں سوڈے کے بلبلوں کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ تھیں مگر اب وہ باسی شراب کی طرح بے رونق تھا وہ سکڑ سا گیا تھا — اس کی حالت ویسی ہی تھی — جیسے بھیگی ہوئی پتلون کی ہوتی ہے کرسی پر وہ اس انداز سے بیٹھا تھا — گویا وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہے اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں ایک ایسا لطیفہ بن کر رہ گیا تھا — جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا گیا ہو —

ملک کو اس کی حالت پر بہت ترس آیا — "حمید خدا کے لئے چپ ہو جاؤ — واللہ تمہارے آنسوؤں سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے — نشہ تو بس کر کرا ہی ہو گیا تھا — مگر یوں منہ اٹھائے ایکا ایکی آنسو بہانے سے میں بہت مغموم ہو گیا ہوں"

خدا جانے تمہیں کیا تکلیف ہے —

"کچھ نہیں، میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا — کبھی کبھی مجھے ایسی تکلیف ہو جایا کرتی ہے — یہ کہہ کر وہ اٹھا — اب میں اجازت چاہتا ہوں"

کرپا رام بوتل میں بچی ہوئی شراب کو دیکھتا رہا اور ملک یہ ارادہ کرتا رہا کہ حمید سے آج پوچھ ہی لے کہ وقتاً فوقتاً اسے یہ دورے کیوں پڑتے ہیں — مگر وہ جا چکا

تھا۔ حمید گھر پہنچا تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ کمرے میں چونکہ اس کے سوا کوئی اور نہ تھا، اس لئے وہ رو بھی نہ کر سکتا تھا۔۔ ایسے آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی آنکھوں کو کرسیاں اور میزیں نہیں چھلکا سکتی تھی۔

اس کی خواہش تھی کہ اس کے پاس کوئی آدمی موجود ہو۔ جس کے چھیڑنے سے وہ جی بھر کر رو سکے، مگر ساتھ ہی اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ اکیلا ہو۔۔ ایک عجیب کشمکش اس کے اندر پیدا ہو گئی۔

وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا۔ جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے، سامنے میز پر اس کی پرانی تصویر چمکدار فریم میں جڑی رکھی تھی۔ حمید نے اداس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو سات برس تصویر اور اس کے درمیان تھان کی طرح کھلتے چلے گئے۔

ٹھیک سات برس پہلے برسات کے ان ہی دنوں میں رات کو وہ ریلوے ریستوران میں ملک عبدالرحمٰن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس وقت کے حمید اور اس وقت کے حمید میں کتنا فرق تھا۔ کتنا فرق تھا، حمید نے یہ فرق اس شدت سے محسوس کیا کہ اسے اپنی تصویر میں ایک ایسا آدمی نظر آیا جس سے ملے اس کو ایک زمانہ گذر گیا ہو۔

اس نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ تو اس کے دل میں یہ تلخ احساس پیدا ہوا کہ انسانیت کے لحاظ سے وہ اس کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ تصویر میں جو حمید ہے اس حمید کے مقابلے میں بدرجہا افضل و برتر ہے جو کرسی پر نیوا اٹھائے بیٹھا ہے، چنانچہ اس احساس نے اس کے دل میں تمید بھی پیدا کر دیا۔

ایک بیجے، صرف ایک سجدے نے اس کا ستیاناس کر دیا تھا آج سے ٹھیک

سات برس پہلے کا ذکر ہے، برسات کے یہی دن تھے، رات کو ریلوے ریستوران میں اپنے دوست ملک عبدالرحمٰن کے پاس بیٹھا تھا، حمید کو یہ شرارت سوجھی تھی کہ بغیر بو کی شراب جن کا ایک پورا پیگ لیمونیڈ میں ملا کر اس کو پلا دے اور جب وہ پی جائے تو آہستہ سے اس کے کان میں کہے، مولانا ایک پورا پیگ آپ کے نوالوں بھرے پیٹ میں داخل ہو چکا ہے۔

بیرے سے مل ملا کر اس نے اس بات کا انتظام کر دیا تھا کہ آرڈر دینے پر لیمونیڈ کی بوتل میں جن کا ایک پیگ ڈال کر ملک کو دیدیا جائیگا، چنانچہ ایسا ہوا کہ حمید نے وسکی پی اور ملک بظاہر بے خبری کی حالت میں جن کا پورا پیگ چڑھا گیا۔

حمید چونکہ تین پیگ پینے کا ارادہ رکھتا تھا— اس لئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ملک صاحب، آپ یوں بیکار نہ بیٹھئے میں تیسرا پیگ بڑی عیاشی سے پیا کرتا ہوں۔ آپ ایک اور لیمونیڈ منگوائیے۔

ملک رضامند ہو گیا، چنانچہ ایک اور لیمونیڈ آ گیا۔ اس بیرے نے اپنی طرف سے جن کا ایک پیگ ملا دیا تھا۔

ملک سے حمید کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حمید اس شرارت سے باز رہتا مگر ان دنوں وہ اس قدر زندہ دل اور شرارت پسند تھا کہ جب بیرا ملک کے لئے لیمونیڈ کا دوسرا گلاس لایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو وہ اس خیال سے بہت خوش ہوا کہ اس کے بجائے دو پیگ ملک کے پیٹ کے اندر پہنچ جائیں گے

ملک آہستہ آہستہ لیمونیڈ ملی جن پیتا رہا۔ حمید دل ہی دل میں اس کبوتر کی طرح پھڑکتا رہا جس کے پاس ایک کبوتری آ بیٹھی ہو۔

اس نے جلدی جلدی اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور ملک سے پوچھا۔ اور پییں گے آپ ۔؟

ملک نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا نہیں پھر اس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔ اگر تم نے پینا ہے تو پیو ــــ میں جاؤں گا مجھے ایک ضروری کام ہے۔

اس مختصر گفتگو کے بعد دونوں اٹھے۔ حمید نے دوسرے کمرے میں جا کر بل ادا کیا۔ جب وہ ریسٹورانٹ سے باہر نکلے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حمید کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی کہ وہ ملک پر اپنی شرارت واضح کر دے مگر اچھے موقعے کی تلاش میں کافی وقت گذر گیا۔ ملک بالکل خاموش تھا اور حمید کے اندر پھلجڑی چھوٹ رہی تھی بے شمار ننھی اور خوبصورت اور شوخ و شنگ باتیں اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو کر بجھ رہی تھیں۔

وہ ملک صاحب کی خاموشی سے پریشان ہو رہا تھا اور جب اس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہ کیا تو آہستہ آہستہ اس کی طبیعت پر افسردگی سی طاری ہو گئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی شرارت اب دم کٹی گلہری بن کر رہ گئی ہے ــــ

دیر تک دونوں بالکل خاموش چلتے رہے۔ جب کمپنی باغ آیا تو ملک ایک بنچ پر متفکرانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ چند لمحات ایسی خاموشی میں گذرے کہ حمید کے دل میں وہاں سے اٹھ بھاگنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مگر اس وقت زیادہ دیر چپ رہنے کے باعث اس کی تمام تیزی و طراری ماند پڑ چکی تھی۔

ملک بنچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ حمید! تم نے مجھے روحانی تکلیف پہنچائی ہے۔ تمہیں شرارت نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ اور آواز میں درد پیدا ہو گیا۔ تم نہیں جانتے

کہ تمہاری اس شرارت سے مجھے کس قدر روحانی تکلیف پہنچی ہے "

"اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے "

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور حمید اپنے آپ کو بڑی شدت کا گنہگار محسوس کرنے لگا۔ معافی مانگنے کا خیال اس کو آیا تھا۔ مجو باغ سے نکل کر باہر سڑک پر ملک پہنچ چکا تھا۔ ملک کے چلے جانے کے بعد حمید گناہ اور ثواب کے چکر میں پھنس گیا۔ شراب کے حرام ہونے کے متعلق جتنی باتیں لوگوں سے سنی تھیں سب اس کے کانوں میں سنسنانے لگیں۔

شراب اخلاق بگاڑ دیتی ہے۔ شراب خانہ خراب ہے۔ شراب پی کر آدمی بے ادب اور بے حیا ہو جاتا ہے۔ شراب اسی لئے حرام ہے شراب صحت کا ستیاناس کر دیتی ہے اس کے پینے سے پھیپھڑے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ شراب شراب شراب کی ایک لا متناہی گردان حمید کے دماغ میں شروع ہو گئی اس کی تمام برائیاں یکایک کمرے کے سامنے آ گئیں مگر سب سے بڑی برائی تو یہ ہے حمید نے محسوس کیا کہ میں نے بے ضرر شراب سمجھ کر ایک شریف آدمی کو دھوکے سے شراب پلا دی ہے ممکن ہے وہ پکا نمازی اور پرہیزگار ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطی میری ہے اور سارا گناہ میرے ہی سر ہو گا۔ مگر اسے جو روحانی تکلیف پہنچی ہے اس کا کیا ہو گا واللہ باللہ میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ اسے تکلیف پہنچے میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔

لیکن اس سے معافی مانگ کر بھی تو میرا گناہ ہلکا نہیں ہو گا۔ ایک میں نے شراب پی دوسرے میں نے اس کو دھوکا دیکر پلائی۔

دیکھتے دیکھتے نشہ اس کے دماغ میں جمائیاں لینے لگا۔ جس سے اس کا احساس گناہ گھناؤنی شکل اختیار کر گیا مجھے معافی مانگنی چاہیئے مجھے شراب چھوڑ دینی چاہیئے۔ میں گنہگار ہوں

سے پاک زندگی بسر کرنی چاہیئے —

اس کو شراب شروع کئے صرف دو برس ہوئے تھے۔ ابھی تک وہ اس کا عادی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دوسری باتوں کے ساتھ اس پر بھی غور کیا میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ یہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے" اس کے بغیر بھی میں زندہ رہ سکتا ہوں — دنیا کہتی ہے —— دنیا — کہتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ منہ سے لگی ہوئی یہ چھوٹ ہی نہیں سکتی میں اسے بالکل چھوڑ دوں گا۔ میں اس خیال کو غلط ثابت کر دوں گا —"

یہ سوچتے ہوئے حمید نے خود کو ہیرو محسوس کیا۔ پھر ایک دم اس کے دماغ میں خدا کا خیال آیا جسے اس نے تباہی سے بچا لیا تھا — مجھے شکر بجا لانا چاہیئے۔ کہ میرے سینے میں لڑ پیدا ہو گیا ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اس کھائی میں پڑا رہتا —

وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا اوپر آسمان گدلے بادلوں میں چاند کے جھاگ لگے گالوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہوا خشک تھی وہ بالکل خاموش تھی۔

حمید پر خدا کا رعب اور شراب نوشی سے بچ جانے کے احساس نے رقت طاری کر دی۔ اس نے شکرانے کا سجدہ ادا کرنا چاہا۔ اس خیال سے کہ کوئی اسے دیکھ لیگا۔ وہ کچھ دیر کیلئے ٹھٹک گیا۔ مگر فوراً ہی یہ سوچ کر کہ یوں خدا کی نگاہوں میں اس کی وقعت بڑھ جائیگی وہ ڈرگی بھانے کے انداز میں جھکا اور اپنی پیشانی گلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھریلے فرش کے ساتھ جوڑ دی —

جب وہ اٹھا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑا آدمی محسوس کیا اس نے جب آس پاس کی اونچی اونچی دیواروں کو دیکھا تو وہ اسے اپنے قد کے مقابلے میں بہت

پست معلوم ہوئیں —

اس واقعہ کے ڈیڑھ مہینے بعد اسی کمرے میں جہاں اب حمید بیٹھا اپنی سات برس کی پرانی تصویر پر ٹکٹکی لگا رہا تھا، اس کا دوست ملک آیا اندر آتے ہی اس نے اپنی جیب سے بلیک اینڈ وائٹ کا ادھا نکالا اور زور سے میز پر رکھ کر کہا ا دحمید بیٹے آج خوب پئیں - یہ ہو جائے گی تو اور لائیں گے -

حمید اسقدر متحیر ہوا کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا - ملک نے دوسری جیب سے سوڈے کی بوتل نکالی تپائی پر سے گلاس اٹھا کر اس میں شراب انڈیل، سوڈے کی بوتل انگوٹھے سے کھولی اور حمید کی متحیر آنکھوں کے سامنے وہ پیگ غٹا غٹ پی گیا —

حمید نے تتلاتے ہوئے کہا - لیکن - - - لیکن - اس روز تم نے مجھے برا بھلا کہا تھا۔ ملک نے ایک قہقہہ بلند کیا تم نے مجھ سے شرارت کی میں نے بھی اس کے جواب میں تم سے شرارتاً کہہ دیا مگر بھئی ایمان کی بات ہے جو مزہ اس روز جن کے دو پیگ پینے میں آیا ہے زندگی بھر کبھی نہیں آئیگا لو چھوڑ و اب اس قصے کو وسکی پیو جن دن بجو اس ہے شراب پینی ہے تو وسکی پیئو —

یہ سن کر حمید کو محسوس ہوا تھا کہ سجدہ اس نے گلی میں کیا ٹھنڈے فرش سے نکل کر اس کی پیشانی پر چھا گیا تھا —

یہ سجدہ بھوت کی طرح حمید کی زندگی سے چمٹ گیا تھا اس نے اس سے نجات حاصل کرنے کیلئے پھر پینا شروع کیا مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا

ان سات برسوں میں جو اس کی پرانی تصویر اور اس کے درمیان کھنچے ہوئے

سجدہ بیشمار مرتبہ حمید کو اس کی اپنی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کر چکا تھا۔ اس کی خودی اس کی تخلیقی قوت اس کی زندگی کی وہ حرارت جس سے حمید اپنے ماحول کو گرمائے رکھنا چاہتا تھا۔ اس سجدے نے قریب قریب سرد کر دی تھی۔ یہ سجدہ اسکی زندگی میں ایک ایسی خواب بریک بن گئی تھی۔ جو کبھی کبھی اپنے آپ کو اس کے چلتے ہوئے پہیوں کو ایک ڈھکے کے ساتھ ٹھہرا دیتی تھی۔

سات برس کی پرانی تصویر اس کے سامنے میز پر تھی جب سارا واقعہ اسکے دماغ میں پوری تفصیل کے ساتھ دہرایا جا چکا ہے تو اسکے اندر ایک ناقابلِ بیان اضطراب پیدا ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اسکو قے ہونیوالی ہے۔

وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے، اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ اے خدا میرا سجدہ مجھے واپس دیدے۔

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے ان گوروں کے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی، لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ دِس لائف ویری بیڈ یعنی زندگی بہت بری ہے جبکہ کھانے کو ہی نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں اچھے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر ان کی زبان سے لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوئی تھی اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی۔ صاحب ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔ اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے۔ تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینی شروع کر دیتی وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے

تو وہ ان سے کہتی صاحب ایک الو کا پٹھا ہے صاحب حرام زادہ ہے۔ سمجھایہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان کی باتیں کرتی۔ یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

لیکن یہاں دہلی میں جب سے وہ آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے۔ جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں۔ مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ یعنی مہینے میں دو اور ان چھ گاہکوں سے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہیں دیں گے، نہ جانے کیا بات تھی ان میں سے ہر ایک نے صرف تین روپے کے قابل سمجھا، چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا دیکھو میں روپے ایک ٹیم کے لوں گی، اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو میں نہیں لوں گی اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ چھٹے آدمی نے کوئی تکرار نہ کیا۔ اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا۔ تو سلطانہ نے کہا لائیے ایک روپیہ دودھ کا اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا۔ لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے، غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ... بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا

کرایہ تھا۔ جس کو مالک مکان انگریزی میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں نیا پاخانہ تھا۔ جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی۔ اور بڑا شور ہوتا ہے شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا پہلے دن رفع حاجت کے لیے جب وہ اس پاخانہ میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکتی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا کہ چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کیلئے تیار کئے گئے ہیں یہ زنجیر اس لئے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو۔ اور سہارا مل جایا کرے۔ مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور ایک دم پانی اس شور کے ساتھ نکلا کہ ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرہ میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی وہ دوڑ کر باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا کیا ہوا؟ یہ چیخ تمہاری تھی۔۔۔

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا یہ موا پاخانہ ہے یا کیا ہے ریل گاڑی کی زنجیر کی طرح کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا۔ میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکہ ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پاخانہ کی بابت سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے۔ جس میں زنجیر ہلانے سے تمام گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

• خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔

خدا بخش راولپنڈی کا تھا، انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہوگئی۔ اس عورت کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لیے اس نے عورت کو پیشے پر بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں انبالہ آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے پر ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا، عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے۔ جس کے آنے سے اتنی ترقی ہوگئی۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔

سارا دن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا ہی پسند کرتا تھا۔

چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی۔ جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ خرید لیا، آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا۔ دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے اپنا علیحدہ کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا، چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں

قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں سے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے بے تعداد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔ اس کی آمدنی پہلے سے دوگنی ہو گئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لیئے بندے خریدے ساڑھے پانچ تولہ کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوالیں، دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں، گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں بڑی خوشحالی تھی۔ مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی، سلطانہ انکار کیسے کرتی۔ جب کہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس لیے خوشی خوشی دہلی جانا پسند کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں ان کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی، پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی، جس سے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا سامان بیچ باچ کر خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پہ ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا، جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکان کی لمبی سی قطاریں سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی میونسپل کمیٹی نے سڑک کا یہ حصہ کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ تاکہ شہر میں یہ جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ، چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی۔ پر جب لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی

پر لگا لیا۔ تو اس کو نشانی مل گئی۔ یہاں میلے کپڑے کی دھلائی کی جاتی ہے۔ یہ بورڈ پڑھتے ہی اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔۔ اسی طرح اس نے بہت سی نشانیاں پیدا کر لی تھیں مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں کوئلوں کی دکان لکھا تھا۔ وہاں اس کی ایک سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی۔ جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں شرفا کے اعلیٰ کھانے کا انتظام ہے لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی مختار رہتی تھی نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی۔ جو اس کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی، چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانہ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی، اس لئے وہ انوری کے پاس ہی رہا کرتے تھے۔

دوکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ ایک مہینے تک سلطانہ بے کار رہی تو اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی اس نے خدا بخش سے کہا کیا بات ہے خدا بخش دو مہینے آج پورے ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے۔ کسی نے ادھر کا رخ نہیں کیا مانتی ہوں آجکل بازار بہت مندا ہے پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی دیکھنے میں ہی نہ آئے، خدا بخش کو بھی یہ بات عرصہ سے کھٹک رہی تھی۔ مگر وہ خاموش تھا۔ جب سلطانہ نے خود بات چھیڑ دی تو اس نے کہا میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ جنگ کی وجہ سے لوگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا راستہ بھول گئے ہیں۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل۔ جس سے تین روپے کا سودا

طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے۔ کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو آمدن کچھ بھی نہیں تھی ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے، سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگھیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں، آخری کنگھی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا تم میری سنو اور چلو واپس انبالے میں یہاں کیا دھرا ہے دھرا بھی ہو گا۔ پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا۔ چلو ہیں چلتے ہیں جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو اس کنگھی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ تیار کرتی ہوں، آج رات کی گاڑی یہاں سے چل دیں گے۔

خدا بخش نے کنگھی سلطانہ کے ہاتھ سے لی۔ اور کہا۔ نہیں جانِ من انبالہ اب نہیں جائیں گے، یہیں رہ کر دلی میں کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی اللہ پر بھروسہ رکھو، وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی تو کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دیگا۔

سلطانہ چپ ہو رہی چنانچہ آخری کنگھی بھی ہاتھ سے اتر گئی ٹنڈے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا جب پانچ مہینے گذر گئے۔ اور آمدن خرچ سے چوتھائی سے بھی کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی

دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ ہر روز ان کے ہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا۔ اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ ان سہیلیوں سے ملنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیہ کاٹتی رہتی کبھی اپنے پرانے پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور باہر بالکونی میں آکر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔ سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں، اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر لگے تھے بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی۔ جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں کبھی ادہر اور کبھی ادہر ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح دکھائی دیتا تھا بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آیا وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دیکر چھوڑ دیا ہے۔ اور وہ خود بخود جا رہی ہے دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ جا رہی ہے۔ نہ جانے کہاں پھر ایک روز وہ آئیگا

جب اس کے دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائیگا۔ اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا ہو گا۔

یوں تو وہ گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پڑلیوں اور بھرے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی اس پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھیں۔ تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اب بھی تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ خیال نہ آتا تھا کہ جو سامنے ریل کی پڑلیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ، دھواں اٹھ رہا ہے۔ ایک بہت بڑا چکلہ ہے بہت سی گاڑیاں ہیں جن کے موٹے موٹے انجن ادہر ادہر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے تھے۔ جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گذرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا۔ کہ کوئی آدمی چکلے کے بازار میں سے اوپر کو کھٹوں کیطرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا خدا بخش سے اس نے بارہا کہا۔ دیکھو میرے حال پر رحم کرو یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔ مگر اس نے بار بار سلطانہ کو یہ کہہ کر تشفی کر دی جانِ من میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا۔

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے -- مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پہ آ رہا تھا۔ مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیض بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کیلئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی۔ کیونکہ یہ نیا فیشن ہے اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی۔ جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو احساس نے دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی --

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ دیر تک وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اٹھ کر بالکونی میں چلی گئی۔ تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو چکے تھے۔ جو تاک جھانک کرنے کے بعد گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی

اور اس کو بھول گئی۔ کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر انجن نمودار ہو چکا تھا سلطانہ نے اس کی طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا سلطانہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا۔ کدھر سے آؤں، سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھا دیا جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لئے کہا۔ آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے۔ وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ ڈرنے کی بات ہی کیا تھی۔

اس پر سلطانہ نے کہا یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے وہ یہ سن کر مسکرایا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر پسند آیا۔ پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے بہت پسند ہے آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔ یہ کہہ کر اس کے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا آپ جا رہے ہیں۔ اس نے کہا نہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔

سلطانہ نے تینوں کمرے ایک ایک کرکے دکھا دیئے اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا - جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھے تھے - تو اس آدمی نے کہا میرا نام شنکر ہے -

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا - مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی ہے، گٹھیلا اور کسرتی بدن کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے، خاکستری - رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا - سفید قمیض تھی - جس کا کالر گردن سے اوپر اٹھا ہوا تھا -

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا ہے - معلوم ہوتا تھا - شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کیا چنانچہ اس نے شنکر سے کہا -

فرمائیے -

شنکر بیٹھا تھا - یہ سن کر لیٹ گیا - میں کیا فرماؤں - کچھ تم ہی فرماؤ - بلایا تم نے ہے مجھے - جب سلطانہ کچھ نہ بولی - میں اب سمجھا تو مجھ سے سنو - جو کچھ تم نے سمجھا غلط ہے میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دیکر جاتے ہیں ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے - جب مجھے بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے، سلطانہ سن کر چکرا گئی - مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آگئی -

"آپ کام کیا کرتے ہیں ؟"

شنکر نے جواب دیا "یہی جو تم لوگ کرتے ہو"

"کیا ؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں - میں - بس کچھ بھی نہیں کرتی۔"

میں کچھ بھی نہیں کرتا۔"

سلطانہ نے بھنا کر کہا "کوئی بات نہ ہوئی۔"

"آپ کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہوں گے۔"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"تم بھی ضرور کچھ نہ کچھ کرتی ہوں گی۔"

"جھک مارتی ہوں۔"

"میں بھی جھک مارتا ہوں۔"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں۔"

"میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔"

"ہوش کی دوا کرو یہ لنگر خانہ نہیں۔"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں ہوں۔"

سلطانہ یہاں رک گئی اس سے پوچھا یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا "اُلو کے پٹھے۔"

"میں بھی اُلو کی پٹھی نہیں۔"

"مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور اُلو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ بزرگ کے پاس اپنی قسمت

کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے ۔ جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔"
شنکر یہ کہہ کر ہنسا ۔

اس پر سلطانہ نے کہا "تم ہندو ہو۔ اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اُڑاتے ہو۔"

شنکر مسکرایا "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم کا سوال پیدا نہیں کرتے، پنڈت اور مولوی اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف بن جائیں۔"

"جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ۔ بولو رہو گے؟"

"اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں۔"

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی "جاؤ رستہ پکڑو"

شنکر آرام سے اٹھا پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا "میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں جب بھی تمہیں ضرورت ہو بلا لینا ۔ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور ممکن ہے اس کو دھکے دیکر باہر نکال دیا ہوتا ۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی اس لئے شنکر کی باتیں اسے بہت پسند آئیں ۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو ۔"

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا کہنے لگا پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان ہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں گے۔

"کچھ انہوں نے تم سے کہا"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔ پر سلطانہ میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہ جائے گی اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے"

سلطانہ کے خیال میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے روتی آواز میں کہنے لگی۔ "سارا دن گھر سے غائب رہتے ہو میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں نہ کہیں جا سکتی ہوں۔ محرم سر پر آگیا ہے کچھ تم نے اس کی فکر بھی کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا۔

یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے میری سنو تو کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔

خدا بخش دری پر لیٹ گیا کہنے لگا۔ پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تھوڑا سامان چاہیئے۔ خدا کے لئے تم ایسی دکھ کی باتیں کبھی نہ کرو مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں غلطی کی پر جو اللہ کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری کے لئے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "تم خدا کے لئے کچھ کرو چوری کرو یا ڈاکہ مارو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو میرے پاس ایک سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے اسکو میں کالا رنگ دلوالوں گی، سفید نیون کا ایک نیا ڈوپٹہ بھی میرے پاس ہے وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لاکر دیا تھا - یہ بھی قمیض کے ساتھ کالا ہی رنگوا لیا جائے صرف ایک شلوار کی کسر ہے سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کرو — دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو — میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ"

خدا بخش اٹھ بیٹھا "اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی آرہی ہو — میں کہاں سے لاؤں گا - افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس پیسہ نہیں"

"کچھ بھی کرو مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ تعالیٰ دو تین گاہک بھیج دے"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو - جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنہ گز مل جاتی تھی - اب سوا روپیہ گز کے حساب ملتی ہے ساڑھے چار گز پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا "تو اب ان باتوں کو بھول جاؤ - میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں"

ہوٹل سے کھانا آیا - دونوں نے مل کر زہر مار کیا - اور سو گئے صبح ہوئی خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی - کچھ دیر لیٹی رہی کچھ دیر سوئی رہی ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی - دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نیون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیض نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لئے دے آئی

کپڑے دھونے کے علاوہ ان کے ہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں اور پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے یہ کتابیں پڑھتے ہوئے وہ سو گئی جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آکھڑی ہوئی — تقریباً ایک گھنٹہ بالکونی میں وہ کھڑی رہی اب شام ہو گئی۔ اب بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی — وہ سڑک پر آتے جاتے گاہکوں اور موٹروں کی طرف عرصہ سے دیکھ رہی تھی وفعتاً اسے شنکر نظر آیا مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا، سلطانہ نے غیر ارادی طور پر اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا —

جب شنکر اوپر آگیا۔ تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے در اصل اس نے آنے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ — میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا "

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی کہنے لگی "نہیں بیٹھو تمہیں جانے کو کون کہتا ہے" شنکر اس پر مسکرا دیا "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں "

"کیسی شرطیں" سلطانہ نے ہنس کر کہا "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے ؟"

"نکاح اور شادی کیسی ؟ ۔۔۔ نہ تم عمر بھر کسی سے شادی کرو گی نہ میں ۔۔۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں ۔ چھوڑو ان فضولیات کو کوئی کام کی بات کرو"

"بولو کیا بات کروں ۔"

"تم عورت ہو ۔۔۔ کوئی ایسی بات کہ جس سے دو گھڑی دل بہل جائے اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی نہیں اور بھی کچھ ہے"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی ۔ کہنے لگی "صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو ۔"

"جو دوسرے چاہتے ہیں" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ۔ ان میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں ۔ جو پوچھنا نہیں چاہئیں ۔ خود ہی سمجھنا چاہئیں"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا "میں سمجھ گئی ہوں ۔"

"تو کہو کیا ارادہ ہے ۔"

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا "میرا نام شنکر ہے یہ نام بھی اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں ۔ چلو آؤ اندر چلیں ۔"

شنکر اور سلطانہ جب والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے ۔

جانے کس بات پر، جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا "شنکر میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا "پہلے بات بتاؤ"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر یہ ..."

"کہو کہو ... رک کیوں گئی ہو"

سلطانہ نے جرات سے کام لیکر کہا "بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنا سکوں ... یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا۔ جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے"

شنکر نے یہ سن کر کہا "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ پیسے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا "نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو"

شنکر مسکرایا "میری جیب میں اتفاق ہی سے کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ بس اب خوش ہو گئیں" سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر کہا "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو"

سلطانہ نے ہنس کر کہا "تم انہیں کیا کرو گے چاندی کے معمولی بندے ہیں زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے"

اس پر شنکر نے کہا "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی ہے"

"لو لو، دیتی ہو؟"

"لے لو" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے اس کے بعد افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کریگا مگر آٹھ روز کے محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دے دی اور کہا "ساٹن کی شلوار ہے۔۔ دیکھ لینا شاید لمبی ہو۔ اب میں چلتا ہوں"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا ۔۔۔ اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔۔

اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا ۔۔ ساٹن کی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی، سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں کا اور اس سودے کا جو اسے اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔۔

دوپہر کو وہ لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیض اور ڈوپٹہ لے کر آئی تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لئے تو دروازہ پر دستک ہوئی سلطانہ نے دروازہ

کھولا تو انوری داخل ہوئی، اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا "قمیض اور دوپٹہ تو رنگا ہوا ہے پر یہ شلوار نئی ہے۔ کب بنوائی—؟"

سلطانہ نے جواب دیا "آج ہی درزی لایا ہے" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں "یہ بندے تم نے کہاں سے لئے—؟"

انوری نے جواب دیا "آج ہی منگوائے ہیں"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

کبوتروں والا سائیں

پنجاب کے ایک سرد دیہات کے تکیئے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کھُدے ہوئے گڑھے میں بڑے بڑے اپلوں سے آگ سلگا رہی تھی کہ سرد اور مٹیالے دھند لکے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھیں سیکڑ کر اور اپنی کمر کو دوہرا کر کے منہ کے قریب قریب زمین لگا کر اوپر تلے رکھے ہوئے اپلوں کے اندر پھونک گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے تھوڑی سی راکھ اڑتی ہے اور اس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آگئی ہے۔

اپلوں کے اندر آگ سلگتی ہے اور یوں جو تھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے۔ مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر جھریوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔

مائی جیواں یہ آگ کئی مرتبہ سلگا چکی ہے۔ یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اس کے پر دادا نے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے ایک زمانے سے ان کے قبضہ میں تھی۔ گاما سائیں

کے مرنے کے بعد اب اس کی ہوشیار بیوی اس تکیئے کی مجاور تھی، گاما سائیں سارے گاؤں کا ہردل عزیز تھا۔ ذات کا وہ کمہار تھا۔ مگر چونکہ اس تکیئے کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی، اس لئے اس نے برتن بنانے چھوڑ دیئے تھے لیکن اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں۔ بھنگ گھوٹنے کے لئے سال بھر میں چھ کونڈیاں بنایا کرتا تھا۔ جن کے متعلق وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ چوہدری لوہا ہے لوہا۔ فولاد کی کونڈی ٹوٹ جائے پر گاما سائیں کی یہ کونڈی دادا سے تو اس کا پوتا بھی بھنگ گھوٹ کر پیئے۔

مرنے سے پہلے گاما سائیں چھ کونڈیاں بنا کر رکھ گیا تھا۔ جو اب مائی جیواں بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔

گاؤں کے اکثر بڈھے اور جوان تکیئے میں جمع ہوتے تھے اور سردائی پیا کرتے تھے۔ گھوٹنے کے لئے گاما سائیں نہیں تھا پر اس کے بہت سے چیلے چانٹے جو اب سر اور بھویں منڈا کر سائیں بن گئے تھے اس کی بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے اور مائی جیواں کی سلگائی ہوئی آگ سلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔

صبح اور شام تو خیر کافی رونق رہتی تھی مگر دوبارہ آٹھ دس آدمی مائی جیواں کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے، اودھر اودھر کونے میں لمبی لمبی بیل کے ساتھ ساتھ کئی گاہک تھے جن میں گاما سائیں کے ایک بہت پرانے دوست ابو پہلوان نے سفید کبوتر پال رکھے تھے، تکیئے کی دھوئیں بھری فضا میں ان سفید اور چینکبرے کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ بہت بھلی سی معلوم ہوتی تھی جس طرح تکیئے میں آنے والے لوگ شکل و صورت میں معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے اسی

طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیواں کے بڑے لڑکے نے جھانجر پہنا رکھے تھے بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔

مائی جیواں کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبدالغفار تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانیدار کا تھا، جو کبھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کر موقع دیکھنے کے لئے گاؤں میں آیا کرتا تھا۔ اوگا ماسائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیواں اسکے نام میں تھانیداری کی بو۔ سونگھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی۔ خاصا تگڑا جوان تھا پر نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برس میں ہی سچ مچ کا سائیں بن گیا۔ یعنی ناک سے رینٹھ بہنے لگا۔ اور چپ چپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی چھوٹا تھا۔ پر اب اور بھی چھوٹا ہو گیا اور منہ سے ہر وقت لعاب سا نکلنے لگا۔ پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دی ہیں اور اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اسے ڈھارس ہوئی کہ چلو یوں بھی تو کما ہی لے گا۔ کمانا دمانا کیا تھا عبدالغفار جس کو اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے۔ گاؤں میں پھر پھرا کر آٹا، چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا۔ وہ بھی اسی لئے اس کی ماں نے اس کے گلے میں ایک جھولی لٹکا دی تھی جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے کبوتروں والا سائیں اسے اس لئے کہا جاتا تھا کہ اسے کبوتروں سے بہت پیار تھا۔ تکیے میں جتنے کبوتر تھے اس کی دیکھ بھال ابو پہلوان سے زیادہ یہی کیا کرتا تھا۔

اس وقت وہ سامنے کوٹھڑی میں ایک ٹوٹی ہوئی اَٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ باہر اس کی ماں آگ سلگا رہی تھی۔

چونکہ سردیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ اس لئے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے۔ مگر تکیہ جو کہ گاؤں سے کچھ فاصلہ پر تھا، ابھی تک آباد نہ ہوا تھا۔ البتہ دور کونے میں مائی جیواں کی بکری ممیا رہی تھی۔

مائی جیواں آگ سلگا کر بکری کے لئے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی، مڑ کر دیکھا تو اسے ایک اجنبی سر پہ پٹکا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا۔ پگڑی کے ایک پلّو سے اس آدمی نے اپنا چہرہ آنکھوں تک چھپا رکھا تھا۔ جب اس نے موٹی آواز میں "مائی جیواں السلام علیکم" کہا تو پگڑی کا کھردرا کپڑا اس کے منہ پر تین، چار مرتبہ سکڑا اور پھیلا۔

مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کئے بغیر کہا "وعلیکم السلام" "آؤ بھائی بیٹھو۔ آگ تاپو۔"

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھ کر اس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سلگتی رہتی تھی۔ اجنبی اور وہ دونوں پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اس آدمی نے مائی جیواں سے کہا۔ "ماں۔ اللہ بخشے گاما سائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا۔ اس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے صدمہ ہوا۔ مجھے آسیب ہو گیا تھا قبرستان کا جن ایسا چمٹا تھا کہ اللہ کی پناہ گاما سائیں نے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دور ہو گئی۔"

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر آتا تھا ۔ اس نے ادھر ادھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا "میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں" ایک خاص بات کہنے کے لئے

اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں سن رہا اور بھینچے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا "میں سندر ڈاکو کے گروہ کا آدمی ہوں ۔ پرسوں رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ مارنے والے ہیں ، خون خرابہ ہو گا اس لئے میں یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکے کو دور ہی رکھنا ۔ میں نے سنا ہے گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں ، جوان آدمیوں کا لہو ہے بابا ، ایسا نہ ہو کہ جوش میں مارے جائیں اور لینے کے دینے پڑ جائیں ۔ تم ان کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو ۔ تو ٹھیک رہے گا ۔ بس مجھے یہی کہنا تھا ۔ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے "

"السلام علیکم"

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے آلاؤ پر زور زور سے مل کر اٹھا اور جس راستے سے آیا تھا ، اسی راستے سے باہر چلا گیا ۔

سندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا ۔ اس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اسی کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں ۔

بے شمار گیت اس کی بہادری اور بے باکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے اس کا نام سن کر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے ، سندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا ۔ مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو

ہر شخص اس سے اچانک ملاقات کے من گھڑت قصّے سنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا۔ اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قد آور جوان ہے، بڑی بڑی مونچھوں والا، ان مونچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور ہو گیا کہ وہ بڑے بڑے لیموں ان کی مدد سے اٹھا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے مگر بدن اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہوگا۔ بہر حال سب متفقہ طور پر اس کی طاقت اور بے باکی کے معترف تھے۔

جب مائی جیواں نے یہ سنا کہ سندر جاٹ ان کے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آ رہا ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبی کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اس کا شکریہ ہی ادا کر سکی، مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سندر جاٹ کا ڈاکہ معنی رکھتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب اس کے ساتھ والے گاؤں کی سب سے سندر اور چنچل چھوکری ایسی گم ہوئی تھی کہ اب تک اس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ یہ مطلب اب ان کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیواں کے گاؤں کے کسی اور کو نہ تھا۔ مائی جیواں نے سوچا کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کو دے، چوہدری کے گھر خبر کر دے، لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے پچھلے دنوں اس نے تھوڑا سا ساگ مانگا تھا۔ تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ گھسیارام حلوائی کو متنبہ کر دے۔ نہیں وہ بھی ٹھیک آدمی نہ تھا۔

وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی، گاؤں کے سامنے آ بجی وہ ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لاتی اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے قربانی کے

قابل نہ سمجھا۔ اس کے علاوہ اس نے سوچا کہ اگر اس نے کسی کو ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا۔ وہ کسی اور پر مہربانی کرے گا اور یوں تو سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائیگا۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا آئیں وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی نئی چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی اور رحمان کو پرے والے گاؤں میں بھیج دے گی۔

جب وہ سامنے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اسے عبدالغفار یعنی کبوتروں والا کھڑا نظر آیا۔ ماں دیکھ کر وہ ہنسا۔ اس کی یہ ہنسی آج خلاف معمول معنی خیز تھی۔ ماں جیوا اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوشمندی کرتی ہے۔

جب وہ کوٹھڑی کے اندر جانے تو عبدالغفار نے پوچھا' ماں یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟

عبدالغفار اس قسم کے سوال طور پر پوچھا کرتا تھا اس لئے اس کی ماں جواب دیئے بغیر چلی گئی اور اپنے چھوٹے کو جگانے لگی "ارے رحمان۔ اے رحمان اٹھ اٹھ"

بازو جھنجھوڑ کر مائی جیون اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور جب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا ذرا ہوش آگیا تو اس کی ماں نے ساری بات سنا دی رحمان کے اوسان ہوگئے۔ وہ بہت ڈرپوک تھا، گو اس وقت اس کی عمر بائیس سال کی اور کافی طاقتور جوان تھا مگر اس میں ہمت اور شجاعت نام کو نہ تھی

سندر جاٹ !— اتنا بڑا ڈاکو جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا۔ تو پورے بیس گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا۔ پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے آرہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ اسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاری کرنے لگا۔

رحمان کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی جو کہ گاؤں کی ایک بیباک اور شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ گاؤں کے سب لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، بڑے بڑے ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اڑا دیتی تھی، چوہدری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دور دور سے اس کو نیچا دکھلانے کے لئے آتے تھے۔ مگر اس کی کلائی کسی سے بھی نہ مڑی تھی وہ گاؤں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا۔ مگر اس کی یہ ساری اکڑ فوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی تھی، جب اس نے دھان کے کھیت میں اس سے کہا "تجھے گنڈا سنگھ کی کلائی مروڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلے میں کوئی آدمی نہیں رہا— آ میرے سامنے بیٹھ میری کلائی پکڑ، ان دو انگلیوں کی ایک ہی ٹھمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ اڑا دوں تو نیتی نام نہیں"

فضل دین اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور یقین تھا۔ کہ اس کی طاقت اور شہ زوری کے رعب اور دبدبے میں آکر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائے گی۔ لیکن جب اس نے کئی آدمیوں کے سامنے اس کو مقابلے کی دعوت دی تو وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر پر چڑھ جاتی ہے

اور وہ اگر اس کی دعوت قبول کرتا ہے، تو لوگ یہی کہیں گے۔ عورت ذات سے مقابلہ کرتے ہوئے شرم تو نہیں آتی مرد کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے، چنانچہ اس نے نیتی کی دعوت قبول کرلی تھی اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اس نے جب نیتی کی گدرائی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا۔ نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں دھنس گئیں۔ ایک نعرہ بلند ہوا اور نیتی کی کلائی فضل کی گرفت سے آزاد ہوگئی ۔۔ اس دن سے لے کر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی۔

ہاں تو رحمان کو اس نیتی سے محبت تھی، جیسا کہ وہ آپ ڈرپوک تھا اسی طرح اس کا پریم بھی ڈرپوک تھا۔ دور دور سے دیکھ کر وہ اپنے دل کی ہوس پوری کیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی اس کے پاس ہوتی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ چھوکرا جو درختوں کے تنوں کے ساتھ پیٹھ ٹیکے کھڑا رہتا ہے اس کے عشق میں گرفتار رہے۔ اس کے عشق میں کون گرفتار نہ تھا؟ سب اس سے محبت کرتے تھے اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیر پکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناؤ کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں، مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ محبت کرنے کی خواہش البتہ اس کے دل میں اس قدر موجود تھی کہ بالکل اس شرابی کی مانند معلوم ہوتی تھی جس کے متعلق ڈر رہا ہے کہ اب گرا اور اب گرا ۔۔ وہ بے خبری کے عالم میں ایک بہت اونچی چٹان پر پہنچ چکی تھی اور اب تمام گاؤں والے اس کی افتاد کے منتظر تھے جو کہ یقینی تھی ۔۔

رحمان کو بھی اس افتادہ کا یقین تھا۔ مگر اس کا ڈرپوک دل ہمیشہ اسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں، نینی آخر تیری ہی باندی بنے گی اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔ جب رحمان دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہنچنے کیلئے تیار ہو کر تکیئے سے باہر نکلا تو اسے راستے میں نینی کا خیال آ گیا۔ مگر اس وقت اس نے یہ نہ سوچا کہ سندر جاٹ دھاوا بولنے والا ہے۔ وہ دراصل نینی کے تصور میں اس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اس کیساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے محبت کر رہا تھا کہ اسے کسی اور بات کا خیال نہ آیا۔ البتہ جب وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا تو ایکا ایکی اس نے سوچا کہ نینی کو بتا دینا چاہیئے تھا کہ سندر جاٹ آ رہا ہے لیکن اب واپس کون جاتا۔

عبدالغفار۔ یعنی کبوتروں والا سائیں تکیئے سے باہر نکلا اس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ تکیئے سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گذار دیا کرتا تھا شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو ان کے چلنے سے جو دھول اڑتی ہے اس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آ جاتی تھی، گاؤں اس کو پسند نہیں تھا۔ اجاڑ اور سنسان جگہوں سے اسے غیر محسوس طور پر محبت تھی یہاں بھی لوگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے۔ جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کے لئے دعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے مقصد

ہیں کامیاب ہوں گے۔ جوان چھوکریاں بھی چپکے چپکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ ان کے 'ماہیا' کا دل کیسا ہے۔ عبدالغفار ان سوالوں کو اوٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا، اس لئے کہ اسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں لیکن لوگ جو اس کے پاس سوال لے کر آتے تھے اس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ عبدالغفار مختلف کھیتوں میں ہوتا ہوا اس کنوئیں کے پاس پہنچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بیکار پڑا تھا۔ اس کنوئیں کی حالت بہت ابتر تھی اس بوڑھے برگد کے پتے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا اس قدر جمع ہو گئے تھے کہ اب پانی کی سطح نظر ہی نہ آتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی کلڑیوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا بن دیا ہے —— اس فضا میں اس نے اپنے وجود سے اور بھی اداسی پیدا کر دی ہے۔

وہ سناٹے ہوتی چیلوں کی اداس چیخوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اٹھی اور بوڑھے برگد کی شاخوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔

بنتی گا رہی تھی ؎

ماہیا مرے نے باغ لوایا —— چمپا مار وا خواب کھلایا

اسیں تے لوایاں کھٹیاں دے

رائتی سون نہیں دیندیاں اکھیاں دے

اس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے اس میں ہر طرح کے پھول لگائے ہیں، چمپا، مروا وغیرہ کھلاتی ہیں۔

اور ہم نے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں، رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں کتنی انکساری برتی گئی ہے۔ معشوق عاشق کے لگائے ہوئے باغ کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے۔ جس میں حقیر نارنگیاں لگی ہیں اور پھر شب جوانی کا گلہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

گو عبدالغفار میں جذباتِ نازک بالکل نہیں تھے۔ پھر بھی نیتی کی جوان آواز نے اس کو چونکا دیا۔۔۔ اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ نیتی کی آواز ہے۔

نیتی گاتی کنوئیں کی طرف آنکلی۔ غفار کو دیکھ کر وہ دوڑی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی :۔ اوہ غفار سائیں۔۔۔ تم۔۔۔ اور مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں اور اس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی بھی نہیں۔۔۔ دیکھو میں تمہارا منہ میٹھا کراؤں گی اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھ لی اور۔۔۔ لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو۔۔۔ اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا تھوڑی رہتا ہے

وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔۔ اور اس کے میلے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی خلافِ معمول کبوتر دل والا سائیں مسکرایا۔ مگر نیتی اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی اس کی نگاہیں گاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں کھردرے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس نے گردن اٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا غفار سائیں تم اللہ پاک سے محبت کرتے ہو اور میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں، تم میرے دل کا حال سمجھ گئے اللہ میاں کی محبت اور اس کے بندے کی محبت ایک جیسی تو ہو نہیں سکتی۔۔ ارے تم بولتے کیا نہیں۔ کچھ تو بولو۔ کچھ کہو۔۔۔ اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی۔۔ تم نہیں جانتے کہ میں

آج کتنی دیر بول سکتی ہوں ۔ تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی ۔ یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھ گئی اپنے من میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اس نے ایکا ایکی عبدالغفار سے پوچھا سائیں میں کب تھکوں گی ۔

عبدالغفار کے منہ سے لعاب نکلنا بند ہو گیا، اس نے کنوئیں کے اندر جھانک کر کہا " بہت جلد "

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا اس پر نیتی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا "وہ کب ؟ ۔ کب ؟ ۔۔ سائیں کب ؟"

عبدالغفار نے اس کا جواب نہ دیا اور ہول کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ۔ نیتی کچھ دیر کنوئیں کے پاس سوچتی رہی ۔ پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا ادھر چل دی ۔

وہ رات جس میں مندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آ رہا تھا مائی جیواں نے آنکھوں میں کاٹی ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی ۔ وہ بالکل اکیلی تھی رحمان کو اس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا ابو بہلول کبھی کبھی تکیے میں آگ تاپتے تاپتے وہیں الاؤ کے پاس سو جایا کرتا تھا ۔ مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا ۔ چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیواں ہی نے کھلایا تھا ۔

تکیہ گاؤں کے اس سرے پر واقع تھا جہاں لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے ہیں مائی جیواں ساری رات جاگتی رہی مگر اس کو ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہ دی جب رات گذر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ مندر جاٹ کی بابت سوچتی سوچتی سو گئی چونکہ رات کو بالکل نہ سوئی تھی اس لئے صبح دیر کے بعد جاگی کو ٹھڑی سے نکل

کہ جب وہ باہر آئی تو ابو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا تھا اور دھوپ سارے تکیے میں پھیلی ہوئی تھی اس نے باہر نکلتے ہی اس سے کہا ساری رات مجھے نیند نہیں آئی — یہ موا بڑاپا بہت تنگ کر رہا ہے صبح سوئی ہوں اور اب اٹھی ہوں — ہاں تم سناؤ کل کہاں رہے ہو "—؟

ابو نے جواب دیا "گاؤں میں"

اس پر مائی جیواں نے کہا "کوئی تازہ خبر سناؤ"

ابو نے چھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر اور جھپٹ کر ایک کبوتر کو پکڑتے بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا "آج صبح چوپال پر نتھا سنگھ کہہ رہا تھا کہ گام چمار کی وہ لونڈیا — کیا نام ہے اس کا — ہاں وہ نیتی کہیں بھاگ گئی ہے میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا — حرامزادی نے سارے گھر کو سر پہ اٹھا رکھا تھا"

"کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اٹھا کے لے گیا ہے"

مائی جیواں کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا، سندر جاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا پر ایک چھوکری تو غائب ہو گئی تھی اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیتی کا غائب ہو جانا سندر جاٹ سے متعلق ہو جائے۔ چنانچہ وہ تمام لوگوں سے نیتی کے بارے پوچھتی رہی جو تکیے میں آتے جاتے رہے لیکن جو کچھ ابو نے بتایا تھا اس سے زیادہ کوئی بھی نہ بتا سکا۔

شام کو رحمان لوٹ آیا اس نے آتے ہی ماں سے سندر جاٹ کے ڈاکے کے متعلق پوچھا — اس پر مائی جیواں نے کہا "سندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹا - نیتی کہیں غائب ہو گئی ہے — ایسی کہ کچھ پتہ نہیں چلتا —"

رحمان کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں دس کوس اور چلنے کی تھکاوٹ

پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا، اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا ایک دم یہ تبدیلی دیکھ کر ماں جیواں نے تشویشناک لہجہ میں اس سے پوچھا۔

"کیا ہوا بیٹا ؟"

رحمان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا "کچھ نہیں ماں تھک گیا ہوں "

"اور تینی کل مجھ سے پوچھتی تھی ——میں کب تھکوں گی ؟"

رحمان نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا لعاب پونچھ رہا تھا۔ رحمان نے گھور کر دیکھا اور پوچھا کیا کہا تھا۔ اس نے تجھ سے

عبدالغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا کہتی تھی کہ میں تھکتی نہیں ——

"پر اب وہ تھک جائیگی "

رحمان نے تیزی سے پوچھا "کیسے"

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی ——

"مجھے کیا معلوم سدرجا ٹ جانے اور وہ جانے "

یہ سن کر رحمان کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھاگئی اور مائی جیواں کی جھریاں اور زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں ——

اُلّو کا پٹھا

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا راستے میں یہ اس کو ٹھیک طور پر معلوم ہو گیا کہ سونے والے کمرے میں صحن میں غسل خانے کی اندر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو اُلّو کا پٹھا کہے بس صرف ایک بار غصّے میں کسی کو طنزیہ اُلّو کا پٹھا کہہ دے۔

قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی انوکھی خواہشیں پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی وہ بہت خوش تھا رات کو اس کو بڑے پیار کی نیند آئی تھی۔ وہ خود کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن پھر یہ خواہش کیسے اس کے دل میں داخل ہو گئی دانت صاف کرتے وقت اس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جس کے باعث اس کے مسوڑھے چھل گئے اور اصل وہ سوچتا رہا کہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہوئی مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا بیوی سے وہ بہت خوش تھا ان میں کبھی لڑائی نہیں ہوتی تھی۔ نوکروں سے بھی وہ ناراض نہیں تھا۔ اس لئے غلام محمد یا نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار تھا فروری کے سہانے دن تھے جن میں کنوارے پتے کی تازگی تھی ہوا خنک اور ہلکی۔

دن چھوٹے نہ راتیں لمبی — نیچر کا توازن بالکل ٹھیک اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے الّو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دل میں کیوں کر پیدا ہوتی —

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برسوں میں متعدد لوگوں کو الّو کا پٹھا کہا ہوگا — اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی کڑے لفظ اس نے بعض موقعوں پر استعمال کئے ہوں گے، اور گندی گالیاں دی ہوں گی مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی تھی مگر اچانک طور پر اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو الّو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اگر اس نے کسی کو الّو کا پٹھا نہ کہا تو بہت بڑا حرج ہوگا —

دانت صاف کرنے کے بعد اس نے چھلے ہوئے مسوڑوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا — مگر دیر تک ان کو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ گئی جو یکایک اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی —

قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا، آئینہ میز پر رکھ کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا مان لیا کہ میرا کسی کو الّو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے — مگر یہ کوئی بات تو نہ ہوئی — میں کسی کو الّو کا پٹھا کیوں کہوں؟ — میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں —

یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں لٹکے ہوئے ٹاٹ

پر پڑی ایک دم اس کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی - حبیب واہیات نوکر ہے دروازے کے عین بیچ میں حقہ ٹکا دیا ہے میں بھی اس دروازے سے اندر آیا ہوں - اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی تو پائنداز جو کہ مونج کا بنا ہوا ہے جلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی ـــ

اس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے جب وہ بھاگتا ہوا اس کے سامنے آجائے تو وہ بھرے ہوئے حقے کی طرف اشارہ کر کے اس سے صرف اتنا کہے " تم نرے الو کے پٹھے ہو " مگر اس نے تامل کیا اور سوچا کہ یوں بگڑنا اچھا نہیں معلوم ہوتا - اگر غلام محمد کو الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہوگی اور پھر اس بیچارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی ہر روز حقہ پیتا ہوں ـــ

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحہ کے لئے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ اس نے الو کا پٹھا کہنے کا ایک اچھا موقع تلاش کر لیا - غائب ہو گئی ـــ

دفتر کے وقت میں بھی ابھی کافی دیر تھی پورے دو گھنٹے پڑے تھے دروازہ کے پاس کرسی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقہ نوشی میں مصروف ہو گیا ـ

کچھ دیر وہ سوچ بچار کئے بغیر حقے کا دھواں پیتا رہا اور دھوئیں کے انتشار کو دیکھتا رہا - جونہی وہ حقے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لئے ساتھ کے کمرے میں گیا تو اس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی ـ

قاسم گھبرا گیا - بھئی حد ہو گئی ـــ الو کا پٹھا میں کسی کو الو کا پٹھا کیوں کہوں

اور بفرضِ محال میں نے کسی کو الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہوگا۔
قاسم دل ہی دل میں ہنسا وہ صحیح الدماغی آدمی تھا اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جو خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے وہ بالکل بیہودہ اور بے سروپا ہے لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ دبانے پر اور بھی زیادہ ابھر آتی ہے۔
قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے الو کا پٹھا نہ کہے گا خواہ یہ خواہش صدیوں تک اس کے دل میں تلملاتی رہے شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو بھٹکی ہوئی چمگادڑ کی طرح اس کے روشن دل میں چلی آئی ہے اس قدر تڑپ رہی تھی۔
پتلون کے بٹن بند کرتے وقت جب اس نے دماغی پریشانی کے باعث اوپر کا بٹن کاج میں داخل کر دیا تو وہ چلا اٹھا۔ بھئی ہوگا۔
یہ کیا بیہودگی ہے۔۔۔ دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے — الو کا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر بند کرنے پڑیں گے۔ لباس پہن کر وہ پھر میز پر آ بیٹھا اس کی بیوی نے چائے بنا کر اس کے سامنے رکھ دی، توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی توس اتنے اچھے سکے ہوئے تھے کہ بسکٹ کی طرح کرکرے تھے اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی، خمیر سے خوشبو آ رہی تھی، مکھن صاف تھا چائے کی کیتلی بے داغ تھی اس کی ہتھیلی سے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل دیکھا کرتا تھا۔ مگر آج وہ بھی دھبہ نہیں تھا۔
اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا اس کی طبیعت خوش ہو گئی خالص دارجلنگ

کی چائے تھی جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی دودھ کی مقدار بھی صحیح تھی ـــ

قاسم نے خوش ہوکر اپنی بیوی سے کہا آج چائے کا رنگ بہت پیارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔

بیوی تعریف سن کر بڑی خوش ہوئی ۔ مگر اس نے منہ بنا کر ایک انداز سے کہا "جی ہاں ، بس آج اتفاق سے اچھی بن گئی ہے ۔ ورنہ ہر روز آپ کو نیم گھول کر پلائی جاتی ہے ـــ مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے ـــ سلیقے والیاں تو وہ موئی ہوٹل کی چھوکریاں ہیں ۔ جن کے آپ ہر وقت گن گایا کرتے ہیں "

یہ تقریر سنکر قاسم کی طبیعت مکدر ہو گئی ایک لمحے کے لئے اس کے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر الٹ دے اور وہ نیم جو اس نے اپنے بچے کی پھنسیوں کے لئے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقچے پر پڑی تھی گھول کر پی لے مگر اس نے بردباری سے کام لیا ، یہ عورت میری بیوی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بات بہت ہی بھونڈی ہے ۔ مگر ہندوستان میں سب الا ماشاء اللہ کیا بیوی بن کر بھونڈی باتیں کرتی ہیں اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سنتی ہیں ؟ بالکل ایسی قسم کی باتیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں ۔ میری بیوی تو پھر بھی غنیمت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہہ دیتی ہے ۔ کہ اس کی نیت نیک ہوتی ہے ۔ بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہے ۔

یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں طلچے پر سے ہٹالیں، جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا رخ بدل کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا "دیکھو آج نیم کے پانی سے بچے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا نیم زخموں کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے ۔۔۔ اور دیکھو موسمبیوں کا رس ضرور پیا کرو میں دفتر سے لوٹتے ہوئے ایک درجن ضرور لے آؤں گا یہ رس تمہاری صحت کے لئے بہت ضروری ہے "

بیوی مسکرادی "آپ کو ہر وقت میری ہی صحت کا خیال رہتا ہے ۔ اچھی بھلی تو ہوں، کھاتی ہوں، پیتی ہوں ۔ دوڑتی ہوں ۔ بھاگتی ہوں ۔۔ میں نے جو آپ کے لئے بادام منگوا رکھے ہیں ۔۔۔ ابھی آج دس بیس آپ کی جیب میں ڈالے دیتی ہوں گی ۔۔ لیکن دفتر میں کہیں نہ بانٹ دیجئے گا "

قاسم خوش ہو گیا چلو موسمبیوں کے رس اور باداموں نے اس کی بیوی کے مصنوعی غصے کو دور کر دیا ۔۔ اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا ۔ دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان ہی طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا جو اس نے پڑوس کے پرانے شوہروں سے سیکھے تھے اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق ان میں بہت یا تھوڑا رد و بدل کر لیا تھا ۔۔

چائے سے فارغ ہو کر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وہی خواہش پیدا ہو گئی اس مرتبہ اس نے سوچا کہ اگر میں کسی کو الو کا پٹھا کہہ دوں تو کیا حرج ہے ۔ نہ بالکل مجھ سے یہ کہہ دوں الو کا ۔۔ پٹھا تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسکین ہو جائے گی ۔ یہ خواہش میرے سینے میں بوجھ بن کر بیٹھ گئی ہے ۔ کیوں نہ اس کو ہلکا کر دوں دفتر میں ۔۔

اس کو صحن میں بچے کا کموڈ نظر آیا یوں صحن میں کموڈ رکھنا سخت بدتمیزی تھی اور خصوصاً جب کہ ناشتہ کر چکا تھا اور خوشبودار کرکرے توس اور تلے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اس کے منہ میں تھا اس نے زور سے آواز دی "غلام محمد"

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی "غلام محمد باہر گوشت لینے گیا ہے — کوئی کام تھا آپ کو اس سے ؟"

ایک سیکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں کہہ دوں یہ غلام محمد الو کا پٹھا ہے اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں - نہیں۔

وہ خود تو موجود ہی نہیں — پھر — بالکل بیکار ہے — لیکن سوال یہ ہے کہ بیچارے غلام محمد ہی کو کوئی نشانہ بنایا جائے اس کو تو میں ہر وقت الو کا پٹھا کہہ سکتا ہوں —

قاسم نے آدھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا "کچھ نہیں میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے لے آیا کرے — تمہیں کھانا پکانے میں اور جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف کرنی پڑتی ہے" یہ کہتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو فرش پر اس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا یہ سگریٹ اگر بجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اس سے اس کا بچہ رینگتا رینگتا آئے گا اور اسے اٹھا کر منہ میں ڈال لے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے پیٹ میں گڑبڑ مچ جائے گی - قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا — یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمد کو الو کا پٹھا نہیں کہہ دیا اس سے اگر غلطی ہوئی ہے تو ابھی ابھی مجھ سے بھی

تو غلطی ہوئی تھی — اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی ۔

قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح خطوط پر غور و فکر کرنے والا آدمی تھا۔ مگر اس خیال نے اس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اس کی صحیح الدماغی کا دخل تھا کہ وہ احساسِ برتری کو اپنے اندر دبا دیا کرتا تھا۔

موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اس نے بلا ضرورت صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا دراصل کچھ دیر کے لئے خالی الذہن ہو گیا تھا۔

اس کی بیوی ناشتے کا آخری توس کھا چکی تھی قاسم کو یوں ٹہلتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آئی اور کہنے لگی "کیا سوچ رہے ہیں آپ"

قاسم چونک پڑا "کچھ نہیں — کچھ نہیں — دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟" یہ لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی الو کا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی —

اس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا سر ہے نہ پیر بیوی ضرور ہنسے گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بیوی کا ساتھ دینا پڑ گیا چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں الو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دماغ سے نکل جائے گی ۔ مگر اس نے غور کیا ۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ بیوی ہنسے گی اور میں خود بھی ہنسوں گا، لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بن جائے — ایسا ہو سکتا ہے — ہو سکتا ہے کیا ضرور ہو جائیگا اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار خوشگوار بھی پیدا ہو چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا اور

اور ایک لمحہ تک اس کی طرف یوں ہی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا "آج صبح کو آپ کے برخوردار نے وہ ستایا کہ اللہ کی پناہ — بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اسے کموڈ پر بٹھایا اس کی مرضی یہ تھی کہ بستر کو ہی خراب کرے آخر لڑکا کس کا ہے؟"

قاسم کو اس قسم کی چخ چخ پسند تھی ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاج کی جھلک دیکھتا تھا مسکرا کر اس نے بیوی سے کہا "میرا لڑکا میرا ہی ہے مگر — میں نے تو آج تک کبھی خراب نہیں کیا"

بیوی نے اس کی بات کا مطلب سمجھا قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا۔ اس لئے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے منہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لئے کیا کرتا تھا۔ وہ اور بھی خوش ہوا جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئی۔

اچھا! بھئی اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ!"

یہ لفظ ہر روز اس کے منہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چل دیا۔

کشمیری گیٹ سے نکل کر وہ نکلسن پارک کے پاس سے گذر رہا تھا۔ تو اسے ایک داڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر الو کا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی تو یہی جس کو الو کا پٹھا کہہ دینا چاہیئے یعنی جو صحیح معنوں میں الو کا پٹھا ہے — ذرا انداز ملاحظہ ہو — کس انہماک سے ڈرائی کلین کئے جا رہا ہے۔ جیسے کوئی بہت اہم کام سرانجام پا رہا ہے —

لعنت ہے!

لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اس نے تعجیل سے کام نہ لیا اور تھوڑی دیر غور کیا۔ میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر میں نے بلند آواز میں بھی اس کو الو کا پٹھا کہا بھی تو وہ چونکے گا نہیں اس لئے کمبخت اپنے کام میں بری طرح مصروف ہے چاہئے تو یہ کہ اس کے کان کے پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اٹھے تو اسے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے قبلہ آپ الو کے پٹھے ہیں۔ لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔

چنانچہ قاسم نے ارادہ ترک کر دیا۔

اسی اثنا میں اس کے پیچھے ایک سائیکل نمودار ہوئی کالج کی ایک لڑکی اس پر سوار تھی اس لئے کہ پیچھے بستہ بندھا ہوا تھا آناً فاناً اس لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کی دانتوں میں پھنسی لڑکی نے گھبرا کر اگلے پہیے کا بریک دبایا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہو گئی اور جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی، قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لیا اس لئے کہ اس نے حادثے کے ردعمل پر غور کرنا شروع کر دیا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی وہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اس کا بورڈ بہت بری طرح اس میں الجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اس نے سائیکل کا پہیہ ذرا اونچا اٹھایا تاکہ اسے گھما کر ساڑھی کو فری وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ پہیہ گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں کی لپیٹ میں آئی کہ ادھر بیٹی کوٹ کی گرفت سے باہر نکل آئی قاسم بوکھلا گیا اس کی بوکھلاہٹ نے لڑکی کو

بہت پریشان کر دیا۔ زور سے اس نے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا فری دسیلی کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اٹکا رہ گیا اور ساڑھی باہر آ گئی۔۔

لڑکی کا رنگ لال ہو گیا قاسم کی طرف غضب ناک نگاہوں سے دیکھا اور بھینچے ہوئے لہجہ میں کہا "الو کا پٹھا"

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو گی مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑھی کو کیا کیا اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر نظروں سے غائب ہو گئی۔۔۔

قاسم کو لڑکی کی گالی سن کر بہت دکھ ہوا خاص کر اس لئے کہ وہ یہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ بہت صحیح الدماغ تھا ٹھنڈے دل سے اس نے اس حادثہ پر غور کیا۔ اور اس لڑکی کو معاف کر دیا، اس کو معاف کرنا ہی پڑے گا اس لئے کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اور ان عورتوں کو سمجھنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے اپنی لمبی جراب میں اوپر ران کے پاس تین چار کاغذ کیوں اڑس رکھے تھے۔۔۔

تلون

بارش کا شور آہستہ آہستہ شدت پکڑتا گیا۔

نیلم: (ڈرتے ہوئے لہجہ میں) "کھڑکی بند کر دو جمیل ۔ ۔ ۔ ۔ باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ اف، یہ کالی رات کیسی بھیانک ہے"

جمیل: (ہنستا ہے) "ان کالی رسیوں سے جو سانپ کی طرح بل تو کھاتی ہیں مگر ڈس نہیں سکتیں (ہنستا ہے) تمہارے سر کے یہ کالے دھاگے صرف شاعروں ہی کے لئے جان بن سکتے ہیں نیلم۔ ہاں تو کیا کھڑکی سچ مچ بند کر دوں کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے؟"

نیلم: "اس بھیانک رات سے زیادہ اس وقت مجھے تم سے خوف محسوس ہو رہا ہے"
(کھڑکی بند کر دیتی ہے)

جمیل: مگر جلدی سے "اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری زلفیں ہیں"

نیلم: "تو ڈرنا چاہیئے آپ کو"

جمیل: (خوف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ سے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے ہونا چاہیئے۔ اس لئے

کہ خوف ہی تم جیسی عورتوں کو رام کر سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔ وہ شاعر
وہ شاعر ۔۔۔ کیا نام تھا اس شاعر کا۔

نیلم : اب تم اپنے دوست کو اتنی جلدی بھول گئے۔

جمیل : میں اسے اس کی موت کے بعد بھولا ہوں، اس لئے کہ اب اس کو یاد رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا ۔ اور تم اسے تو اس کی زندگی میں ہی بھول گئی تھی۔

نیلم : خدا کے لئے ۔۔۔۔ خدا کیلئے گڑے مردے نہ اکھاڑو جمیل۔

جمیل : جو تم کفنائے بغیر دفن کر چکی ہو ۔۔۔۔۔ نیلم واللہ اگر میں کبھی ۔۔۔ محبت میں گرفتار ہو جاؤں تو مزہ آجائے تمہیں اپنی اس انگوٹھی میں نگینے کی طرح نہ جڑ لوں تو میرا نام جمیل نہیں ۔ ۔۔۔ وہ لوگ بیوقوف تھے جو تمہارے عشق میں آہیں بھرتے مر گئے ۔ مجھے تعجب ہے کہ ان میں سے کسی نے تمہارا گلا کیوں نہیں کاٹ ڈالا یہ سفید سفید گلا جس میں سے تم اتنے اچھے سر نکال سکتی ہو اور اپنے راگ کے جادو چلاتی ہو۔

نیلم : تم کیوں نہیں کاٹ ڈالتے۔

جمیل : اس لئے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔

نیلم : مانتی ہوں ۔ لیکن پھر تم مجھ سے دلچسپی کیوں لیتے ہو؟

جمیل : سیاح جب بمبئے آتے ہیں تو مالا بار کی پہاڑی پر وہ مقام دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

جو تمہارا ایک ایسا تاریخی مقام بن گئی ہو جہاں کئی بے وقوف نے جان دئیے

دی ہے۔۔

نیلم: تم چاہو تو شاعر بن سکتے ہو۔
جمیل: مگر تم چاہو تو کچھ نہیں بن سکتیں۔۔
عورت ازل سے ایک ہی راگ سے گا تی ہے۔ جسے وہ وقت بے وقت گاتی رہتی ہے بتاؤ تمہارے سازِ حیات میں دھوکے اور فریب کے سوا کیا کوئی اور راگ ہے۔
نیلم: بہت سے راگ ہیں۔ جب تم مجھ سے محبت کرو گے سناؤں گی۔
فی الحال یہ چند شعر سنو۔
جمیل: کیا اس بیوقوف شاعر کے ہیں۔۔
نیلم: نہیں میرے اپنے ہیں۔
باجے پر انگلیاں چلاتی ہے اور ذیل کے شعر گاتی ہے۔

(احمد ندیم قاسمی)

زندگی اک سر گرانی ہے
یہ میرا عالم جوانی ہے
یہ جو پلکوں پہ قطرہ خون ہے
تیرے اکرام کی نشانی ہے
مسکرانا جسے نصیب نہ ہو
وہ جوانی بھی کیا جوانی ہے

جمیل: اچھا گاتی ہو اور شراب بھی بری نہیں ۔۔ گلاس میں شراب

انڈیلتا ہے۔

نیلم: (آخری شعر گاتی ہے۔)

ہے ان آنکھوں کا رنگ پانی میں
ورنہ کیا شراب پانی میں

جمیل: خودستائی کا دوسرا نام عورت ہے۔ کیوں نیلم — اور معلوم ہوتا ہے آج کسی نے تمہاری آنکھوں کی تعریف نہیں کی۔ جب ہی تمہیں ان کا رنگ شراب میں گھولنا پڑا۔ بخدا نیلم تم بڑی دلچسپ عورت ہو۔ تمہاری پلکوں میں پھنسے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے ریگستان کے کنوئیں یاد آجاتے ہیں۔ ہاں۔ یہ تو بتاؤ آج تم رو کیوں رہی ہو۔ اگر مجھے مرعوب کرنے کیلئے تم نے آنسو بہائے ہیں تو میں کہوں گا کہ تم نے ناحق تکلیف کی۔ میرے دل کی چھت ٹپکتی نہیں۔

نیلم: باجے کے پردے چھیڑتی ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہے جیسی عورتیں روتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جانتے ہو تم کیوں روتی ہیں۔

جمیل: کہ مرد زیادہ شراب پئے اور گلاس میں شراب ڈالتا ہے۔

نیلم: (تنگ آکر بلند آواز میں) جمیل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ایک دم آواز دبا کر) اب میں تم سے کیا کہوں جمیل۔

جمیل: کہو کہ تم خوب صورت ہو ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری گفتگو ایسی ہے جیسے شراب کے یہ متحرک بلبلے ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری جوانی ایسی ہے جیسے ساز کے تنے ہوئے تار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم عورتوں کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم حسین عورتوں کا

کہو کیا کہو گی ۔۔ ہاں کہو کہ تم حسین عورتوں کا خواب ہو جمیل ۔۔ کہو ایسا ہی کہو ۔۔ او کہے چلی جاؤ ۔۔ اگر عورتیں اپنی تعریف سے خوش ہو سکتی ہیں تو کیا ایک مرد نہیں ہو سکتا ہاں یہ بتاؤ نیلم آج تمہاری شراب سسکیاں کیوں بھر رہی ہے ۔۔۔ میں نے دو گھونٹ پیئے ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ میرے حلق سے دو آہیں نیچے اتر گئی ہیں ۔۔ یہ شراب کسی دل جلے کا تحفہ تو نہیں۔

(کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھل جاتی ہے اور بارش کا شور سنائی دیتا ہے۔)

جمیل: کھڑکی بند کر دو نیلم ۔ باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ گویا ہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے ۔ اف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے

نیلم: اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری گفتگو۔

جمیل: تو مجھ سے ڈرنا چاہیئے تمہیں۔

نیلم: (ہنستی ہے) ڈرنا چاہیئے ۔۔۔۔۔ تمہاری ان باتوں سے جو بالکل کھوکھلی ہیں ۔ (ہنستی ہے) ان چنگاریوں سے جن میں بالکل جلنے کی قوت نہیں، ہاں تو کھڑکی کیا سچ مچ بند کر دوں ۔ کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے (کھڑکی بند کر دیتی ہے)

جمیل: مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام مردوں کی روحیں جو تمہاری محبت کا زہر پی کر اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں آج رات اس کالی بارش میں نہا رہی ہیں نیلم ذرا خیال کرو اگر سچ مچ یہ روحیں تمہارا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں تو ۔۔۔۔۔۔

نیلم : اگر تمہاری روح بھی اس قطار میں ہوئی تو شاید مجھے ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھکنا پڑے۔

جمیل : کیوں۔

نیلم : اس کیوں کا جواب اس وقت دونگی۔ جب تمہاری روح کالی بارش میں نہائے گی اور میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے گی۔

جمیل : اب دلیر ہو گئی ہو۔

نیلم : تم اسے دلیری کہتے ہو۔ مگر یہ عورت کی سب سے بڑی بزدلی ہے۔

جمیل : کیا۔

نیلم : یہی ۔ یہی دلیری۔

جمیل : تمہاری باتیں اس وقت شراب کے گھونٹوں سے زیادہ مزہ دے رہی ہیں۔

نیلم : تو شراب چھوڑ دو یہی پیئو۔

جمیل : بخدا آج تم نے میری طبیعت خوش کر دی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں جب میرے ہوش وحواس بجا نہ رہے تو چند دنوں کے لئے تم سے محبت ضرور کروں گا۔ جانتی ہو محبت کسے کہتے ہیں۔

نیلم : ہوش وحواس بجا نہ رہنے کی صورت تمہیں کسی عورت سے چند دنوں کیلئے کھیلنا۔

جمیل : تمہاری یہ باتیں مجھے کسی روز مجبور کر دیں گی کہ میں۔۔۔۔ کہ میں۔

نیلم : کہو کہو۔

جمیل : کہ میں تمہیں ایک کتاب بنا کر اپنی الماری میں رکھ لوں تم جیسی عورتوں کو فرصت کے وقت ضرور پڑھنا چاہیئے۔

نیلم : پہلے قاعدہ تو پڑھ لیا ہوتا۔

جمیل : ہوشیار طالب علم کیلئے ابتدائی معلومات اتنی ضروری نہیں ہوتیں۔

نیلم : ہائے تمہاری ہوشیاری ۔۔۔ تمہیں اس ہوشیاری پر کتنا ناز ہے۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ہوشیاری کسی عورت کے سامنے گھٹنے ٹیک دے

جمیل : میری ہوشمندی شاعروں کی ہوشمندی نہیں ۔۔۔ ہاں یہ تو بتاؤ تم نے اس بیچارے شاعر سے اتنا برا سلوک کیوں کیا۔

نیلم : اس لئے کہ مجھ سے تمہارا سلوک اچھا نہیں۔

جمیل : یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔

نیلم : اور نہ کبھی آئے گی۔ اپنے گھروں میں آسانی کے ساتھ سوٹ کیسوں کا تالا کھولنے والا مرد جب کسی عورت کے دل کا تالہ کھولنا چاہے تو یہی مشکل پیش آیا کرتی ہے اور وہ لوگ جو تم ایسے مشکل پسند ہوتے ہیں۔ آسانیاں ان کے لئے دشواریاں ہوتی ہیں۔

جمیل : کون سی آسان بات سمجھنا میرے لئے دشوار ہے۔

نیلم : کہ تمہارے برے سلوک نے مجھے تمہارے شاعر دوست سے برا سلوک کرنے پر مجبور کر دیا۔

جمیل : کتنی آزادانہ مجبوری ہے۔

نیلم : تمہیں سیدھی سادھی بات میں الجھاؤ پیدا کر کے شاید لطف آتا ہے۔ لیکن یاد رکھو کسی روز تم خود ان بھول بھلیوں میں پھنس جاؤ گے کہ نکلنے کا نام نہیں لو گے۔ حقائق کا ہر وقت منہ چڑانا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ تم جانتے ہو تم محسوس

کرتے ہو اس لیے کہ محسوس کرنا جاننے سے بہت بہتر ہے کہ تمہارے دوست شاعر کی محبت کو میں نے صرف اسے اس لیے ٹھکرا دیا کہ تمہاری ٹھوکروں سے مجھے پیار ہو گیا تھا۔

جمیل : میں زیادہ شراب، تو نہیں پی گیا۔

نیلم : نہیں تم نے صرف دو گلاس پیئے ہیں۔ مدہوش میں ہو رہی ہوں۔

جمیل : تو پھر کوئی حرج نہیں۔ کہو کیا کہہ رہی تھی۔ تم نے میرے شاعر دوست کی محبت کو صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ میری ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا۔ ہاں پھر کیا ہوا۔

نیلم : جو ہونا تھا۔

جمیل : یعنی۔

نیلم : شاعروں کے سینکڑوں شعر ہر روز پھانکتی رہی۔ مگر میرے دل میں محبت کی شدت پیدا نہ ہوئی اور تمہاری خشک باتوں نے۔ (کھڑکی شور کے ساتھ کھلتی ہے۔ ہوا کی تیز سیٹیاں کمرے میں پھیل جاتی ہیں عباس کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوتا ہے۔ نیلم چیختی ہے۔ ...) عباس عباس،

عباس : (زور سے کھڑکی بند کر دیتا ہے۔ اور فرش پر اپنے وزنی بوٹوں سے چلتا نیلم کے پاس آجاتا ہے) ہاں شاعر عباس۔ ... مگر یہ چیخ کیسی کیا پرانے دوستوں کا استقبال ایسی چیخوں سے کیا جاتا ہے اور جمیل تم کیوں ڈر گئے۔ .. کیا میں تمہارا عزیز دوست عباس نہیں ہوں۔ جس کے سینکڑوں شعر روز پھانکنے پر بھی نیلم کے دل کا ہاضمہ درست نہیں ہوا۔

خبردار جو تم اپنی جگہ سے ہلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا پستول شعر نہیں کہتا۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے بدکلامی ہو جائے ــــ ہاں کہو نیلم تم کیا کہہ رہی تھی ــ جمیل کی خشک باتوں نے کیا کیا۔

نیلم : (کھینچے ہوئے لہجہ میں) عباس تم زندہ ہو۔

عباس : مجھے خود تو یہی محسوس ہوتا ہے ۔

جمیل : ریل گاڑی کے حادثہ میں تمہارے مرجانے کی افواہ

عباس : غلط تھی، لیکن آج شب کے حادثے میں تمہارے مرجانے کی افواہ غلط نہ ہوگی۔

جمیل : تو مجھے ابھی ابھی وصیت کردینا چاہیئے اور اپنی ساری جائیداد تمہارے حق میں محفوظ کر دینی چاہیئے ــ

عباس : تمہاری جائیداد ـــ کیا ہے تمہاری جائیداد ـــ

جمیل : میری خشک باتیں جو تمہارے شعروں کے ساتھ مل کر نیلم کا دل ہے موہ سکیں ــ

عباس : (ایک دم غصے میں آکر) جو میں نہ موہ سکا یہی چاہتے ہو نہ تم (دبی زبان میں) آج تم نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتی تو میرے دل کا بوجھ اس قدر زیادہ نہ ہوتا ــ

وہ بوجھ جواب تمہیں اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑے گا۔ میں بے وقوف ہوں، جیسا کہ نیلم سے کہہ رہے تھے۔ شاعر بے وقوف ہی ہوا کرتے ہیں۔ مگر وہ تم جیسے غدار نہیں ہوتے۔ بھیڑیئے تم جیسے چیتے نہیں ہوتے۔ ۔ ۔ تم

تم نے اپنی طرف سے شاید ایک دیپ کھیل کھیلتے ہیے۔۔۔ مگر جانتے ہو تم نے مجھے بے حد دکھ پہنچایا ہے۔ تم نے میری روح کو پاؤں تلے روند دیا۔

تم نے شاعر کو تکلیف نہیں دی ایک انسان کو دکھ دیا ہے۔ جو محبت میں گرفتار تھا۔ جانتے ہو محبت کرنے والے انسانوں کی روح بہت حساس ہوتی ہے۔

جمیل: میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

عباس: لیکن اب تمہیں کرنا ہوگی۔

جمیل: کس سے۔

عباس: نیلم سے --- اس عورت سے جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ اس مغنیہ سے جس کے حلق سے نکلے ہوئے سروں میں اتنے برس میری روح آشیانہ بناتی رہی اور جس کے تنکے تم نے ہوائی بگولا بناکر اڑا دیئے۔ سنتے ہو اس عورت سے جس کی نسوانیت میری نرم و نازک شاعری نے بنائی ہے۔ تم اپنی کھردری باتوں میں محبت کروگے۔

جمیل: اور تم؟

عباس: تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہوگا۔ اور اس سے میری محبت کا ثبوت یہ ہے کہ مجھے آج نصف شب کے بعد شاعر عباس نیلم پر اپنی جان قربان کردے گا۔ اس دنیا میں چلا جائے گا۔ جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔

جمیل : دوسرے لفظوں میں مجھے اس دنیا میں جانا پڑے گا - جہاں شعریت ہی شعریت ہے -

عباس : تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو -

نیلم : (عباس) خدا کے لئے عباس ایسے بے رحم نہ بنو -

عباس : اس سے تمہاری محبت کا ثبوت لینا کوئی بے رحمی نہیں ۔۔۔۔۔ میں بھی تو اس بات کا ثبوت دوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہے -

نیلم : کیسے ؟

عباس : اس گلاس میں جس میں جمیل شراب پیتا رہا ہے میں زہر گھول رہا ہوں (گلاس کی آواز) پہلا گھونٹ جمیل پئے گا - جب زہر اس کو ہلاک کر دے گا تو دوسرا گھونٹ میں پیئوں گا --

نیلم : یہ کیسے ہو سکتا ہے عباس ۔۔۔۔۔ تمہارا دماغ بہک گیا ہے -

جمیل : اور اگر میں انکار کر دوں تو --

عباس : میرا پستول کبھی انکار نہیں کرے گا -

جمیل : پستول کی گولی سے مرنا شاندار نہیں ۔۔۔ میں زہر پیئوں گا - مگر مجھے اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ میری موت کے بعد تمہاری موت بھی ہوگی - کیا نیلم مجھے اس بات کا یقین دلا سکتی ہے -

نیلم : میں ۔۔۔ میں ۔۔۔ لیکن عباس شاعر ہے -

جمیل : تو ایسا ہو سکتا ہے - کہ پہلے عباس زہر پئے اور اس دنیا کا دروازہ کھٹکھٹائے جہاں شعریت ہی شعریت ہے --

میں اس کے پیچھے آنے کا وعدہ کرتا ہوں ۔۔۔۔۔ اس تھوڑے وقفے میں مجھے نیلم کی محبت میں گرفتار ہونے کا موقعہ بھی مل جائیگا ۔

نیلم : ایسا کیوں نہ ہو کہ سارا زہر میں ہی اپنے حلق سے نیچے اتار لوں اور پھر تم ایک دوسرے کے دوست بن جاؤ ۔ ایکدوسرے سے محبت کرنا شروع کردو ۔

عباس : (بلند آواز میں) نہیں ہرگز نہیں ۔

موت کا یہ جال میری مرضی کے مطابق پانی میں ڈالا جائیگا ۔ ۔۔۔ پہلے تم اس جال میں آؤ گے ۔ پھر میں ۔۔ اور نیلم زندہ رہے گی ۔ اس کو زندہ رہنا پڑے گا ۔ جب زہر تمہارے اندر سرایت کر جائے گا ۔ اور موت کا مضبوط ہاتھ تمہیں رسی کے مانند بٹ دے گا ۔ تو نیلم کے دل پر تیر ٹیڑھے پڑیں گے ۔۔ اس نیلم کے دل پر جس نے شاعر عباس کا دل فضول سمجھ کر توڑ دیا ۔۔ تم مرو گے اور میں جیوں گا ۔ میں جیوں اور تم مرو گے (دیوانہ وار ہنستا ہے) ہاں تمہیں مرنا ہوگا ۔ میں خود مروں گا مگر زندہ ہو کر اور تم مرو گے ادھ موئے ہو کر (ہنستا ہے) برف کے ٹکڑوں سے اپنی تابانی ادھار لینے والی نیلم کے لئے آج کڑی آزمائش کا دن ۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آج اس کے دو چاہنے والے موت کی گہرائیوں میں اتریں گے ۔

جمیل : مذاق ختم ہو چکا ہے ۔۔۔۔ رات بہت گذر چکی ہے عباس ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب تماشے کو بند کر دینا چاہیئے ۔ نیلم برف کی سلوں سے اپنی

تا بانی ادھار لیتی ہے۔ تم ان سے تھوڑی سی سردی مانگ لو اور خدا کیلئے
اس آگ کو بجھاؤ ـــــ میں آگ تاپنے کا عادی نہیں ہوں"۔

عباس: (زور سے قہقہہ لگاتا ہے) صرف باتیں بنانے کے عادی نہیں ہو۔ تم
آگ لگا سکتے ہو مگر آگ لگا کر اس کا تماشہ دیکھنے کی تاب تم میں نہیں۔

نیلم: تمہاری مٹھی میں چٹان پٹخنا شروع ہو گئی۔ بس اب کچھ دم میں ریزہ ریزہ
ہونا چاہتی ہے ۔۔۔۔ (ہنستا ہے) ۔۔۔۔۔ ۔ تمہیں عورتوں سے
کھیلنا پسند ہے ۔ مگر زہر کا ایک گھونٹ تم سے نہیں پیا جاتا ۔۔۔ میرے
دوست عورتیں زہر سے زیادہ زہریلی ہوتی ہیں ۔

جمیل: مگر ان کے لئے جو ان سے دلچسپی لیتے ہیں ۔

نیلم: عباس ۔۔۔ جمیل ٹھیک کہتا ہے ۔۔۔۔ اسے مجھ سے صرف اس
قدر دلچسپی تھی کہ میں ان کی باتوں سے دلچسپی لوں۔

عباس: کیا دلچسپ بات ہے اور زہر کے یہ گھونٹ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کتنے
پیوگے ۔۔۔ میرے لئے تو ایک ہی کافی ہے ۔

جمیل: نہیں پیوگا ۔

عباس: تمہیں پینا ہوگا ۔۔۔ (گلاس اٹھاتا ہے) اسی شراب میں زہر
ہے ۔ نیلم لپک کر گلاس گرا دیتی ہے ۔ عباس اس کی کلائی پکڑ لیتا ہے ۔
(نیلم کی چوڑیاں کھنکھناتی ہیں) زہر کی پڑیا واپس دے دو نیلم نیلم عباس
کی زبردست گرفت کے باعث کراہتی ہے اور کہتی ہے میری کلائی ٹوٹے
میرا دل ٹوٹ چکا ہے ۔۔۔۔ ۔۔۔ ۔ لاؤ ۔۔۔ ۔ یہ زہر

میرے حوالے کر دو (نیلم کی ہلکی سی چیخ) ------ بس اب ایک طرف ہو
جاؤ اور ہمارا تماشا دیکھو --------- خبردار جمیل ---- اپنی جگہ پر کھڑے
رہو (گلاس اٹھا لیتا ہے) اور اس میں زہر کی پڑیا گھول دیتا ہے -
لو اس کا ایک گھونٹ پی جاؤ — گلاس ہاتھ میں لو ورنہ -

جمیل : ڈرتے ہوئے لہجہ میں) نیلم کیا سچ مچ مجھے یہ زہر پینا پڑے گا -

نیلم : حالات کا تقاضا یہی ہے -

جمیل : حالات کا تقاضا ----- حالات کا تقاضا ----- مجھے حالات سے کیا واسطہ ہے ۔ مجھے کسی سے کوئی واسطہ نہیں -
نیلم یہ کیا ہو رہا ہے — خدا کے لئے مجھے موت سے بچاؤ —

عباس : (ہنستا ہے)

نیلم : پی جاؤ --- میرا منہ کیا دیکھتے ہو — شہد سمجھ کر پی لو -

جمیل : شہد — شہد -

عباس : (بلند آواز میں) پی جاؤ ---- ورنہ

نیلم : پی جاؤ نہیں کچھ نہیں ہو گا -

جمیل : کیسے - کیسے -

عباس : پی جاؤ —

نیلم : پی جاؤ — پی جاؤ —

عباس : بس ایک گھونٹ باقی میری طرف بڑھا دو -

نیلم : پی جاؤ — ڈرو نہیں -

جمیل : پی جاؤں —

عباس : ہاں ہاں پی جاؤ —

نیلم : پی جاؤ —

عباس : وقت ضائع نہ کرو —

جمیل : تم بھی پیو گے —

نیلم : ڈرتے کیوں ہو —

جمیل : گلاس میں سے زہر پیا ہے - حلق میں غرغراہٹ پیدا ہوتی ہے اور
پھر کھانستا ہے —

نیلم : بس اتنی سی بات تھی —

عباس : بس اتنی سی بات تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاؤ گلاس مجھے دو - شاباش
ارے تمہارا رنگ اتنی جلدی زرد کیوں ہو گیا - ابھی تو زہر تمہارے
اندر ٹھیک طور سے اندر اترا بھی نہیں —

نیلم : گھبراؤ نہیں جمیل حوصلہ رکھو -

عباس : حوصلہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زہر پی کر یہ کس قسم کا حوصلہ کر سکتا ہے - لو دیکھو مٹھیاں
بھینچنا شروع ہو گئیں -

جمیل : عباس

عباس : عباس کو کیوں پکارتے ہو ۔ ۔ ۔ اس کا نام لو ورنہ تمہاری جان نکل
جائے گی -

نیلم : پریشان کیوں ہوتے ہو جمیل ۔ ۔ ۔ تم نہیں مرو گے -

جمیل: نیلم — میں۔

عباس: (زور زور سے ہنستا ہے) ہا ہا ہا۔۔۔۔ بس پانچ منٹ میں تمہاری
لاش اس فرش پر ہو گی۔ اور مکھیاں بھنبھا رہی ہوں گی۔ تمہارے
اس منحوس جھولے پر جو ابھی سے نیلا پڑ گیا ہے۔

جمیل: نیلا۔۔۔۔ تم قاتل ہو۔۔۔۔ تم میرے قاتل ہو۔۔۔۔ میں شور مچانا
شروع کر دوں گا۔

عباس: کچھ فائدہ نہ ہو گا۔۔۔۔ چیخنے اور چلانے سے جو کام تم کرنا چاہتے ہو
وہ میں خود کرنے والا ہوں اس گلاس کا باقی زہر میرے اندر چلا جائیگا
مگر تمہیں پہلے مرنا ہو گا ہم میری جان گئی کا تماشا نہیں دیکھو گے اس
کا مزہ صرف میں لوں گا۔ (ہنستا ہے) نیلم ذرا اس بہادر کی حالت
تو دیکھو جس کی ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا (ہنستا ہے)
ہا ہا ہا — تم کانپ رہے ہو جمیل۔ تمہارا دل رواں کانپ رہا ہے
۔۔۔۔ زہر نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ بس اب تم چند گھڑیوں
کے مہمان ہو۔

جمیل: (ادلوا: وار) میں نہیں مرنا چاہتا۔
میں نہیں مرنا چاہتا۔ کوئی مجھے بچائے۔ کوئی مجھے بچائے۔

عباس۔ شریف آدمیوں کی طرح جان دو جمیل۔
چیخو چلاؤ نہیں موت بہت محال ہوتی ہے۔

جمیل: موت۔۔۔۔ موت۔

نیلم : ڈرو نہیں تم زندہ رہو گے۔

عباس : (ہنستا ہے) تم زندہ رہو گے اس لئے کہ تم اس صورت کے لئے اپنی جان دے رہے ہو (ہنستا ہے)۔ تمہارا رنگ اب نیلا بالکل پڑ گیا ہے ہونٹ خزاں دیدہ پتوں کی مانند کانپ رہے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بلبلوں کی طرح ابل رہی ہیں (ہنستا ہے) بس تم اب چند گھڑیوں کے مہمان ہو۔ کچھ کہنا ہو تو کہہ لو نیلم سے (ہنستا ہے) میں کتنا خوش ہوں (ہنستا ہے)۔ قہقہوں کے درمیان جمیل دیوانہ وار چلاتا ہے۔! پانی پانی !!

نیلم کہتی ہے : تمہیں کیا ہے جمیل۔ تم تو سچ مچ مر رہے ہو۔

(عباس ہنستا ہے آخر میں دھڑام سے جمیل زمین پر گر پڑتا ہے۔)

عباس : مر گیا — تو اب میں چلا — (اسی گلاس میں سے زہر پیتا ہے) اور ہونٹ چاٹتا ہے — لوگ کہتے ہیں زہر کڑوا ہوتا ہے۔ مگر یہ تو میٹھا تھا، —

نیلم : جمیل! — جمیل! — جمیل! — عباس جمیل تو سچ مچ مر گیا۔

عباس : تو کیا جھوٹ کی موت مرتا نیلم اب اس کا ذکر نہ کرو جو مر کھپ چکا ہے۔ میرے ساتھ باتیں کرو جو ابھی مرا نہیں ہے (ہنستا ہے) موت۔ موت اور زندگی میں فرق ہی کیا ہے — زندگی ایک نیند ہے۔ جس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ اور موت ایسی نیند ہے جس میں آنکھیں

بند رہتی ہیں —

نیلم : (آہ بھر کر) جمیل مر گیا۔

عباس : لو اب میری باری ہے ایک مرد جس سے تمہیں محبت تھی موت کی آغوش میں جا چکا ہے — دوسرا جس کو تم سے محبت ہے جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

نیلم : تم غلط کہتے ہو — مجھے جمیل سے محبت نہیں تھی۔

عباس : پھر کس سے تھی؟

نیلم : اس کی خشک باتوں سے — تم لوگ اتنی معمولی سی بات کیوں نہیں سمجھتے — بادلوں میں گھرے لوگ کیا آسمان کی خواہش نہیں کرتے برف کے تودوں میں دبی ہوئی چیزیں کیا سورج کی تپش کے لئے نہیں تڑپتیں زمین پر رہنے والے کیا تاروں کی طرف للچائی نظروں سے نہیں دیکھتے — کیا فرشتوں نے آسمان چھوڑ کر زمین پر آنے کی غلطی نہیں کی۔ شعروں کے نرم و نازک بستر سے نکل کر حقیقت کے پتھروں سے چلنے پھرنے کی خواہش کیا دل میں پیدا نہیں ہو سکتی — اور پھر نیلم تو ایک عورت ہے۔

عباس : عورتوں اور چڑیوں کا فلسفہ سمجھ سے ہمیشہ اونچا رہا ہے۔

نیلم : اس لئے کہ تم شاعر زیادہ اور آدمی کم ہو — عباس باہر نکلتے کر شعریت کی نظروں سے دیکھو — مگر عورت کو ہمیشہ اپنی نظروں سے دیکھو۔

عباس : (آہستہ سے) یہ دونوں آنکھیں اب موت ہمیشہ کے لئے بند کر دے گی۔

(حیرت سے) مگر اس زہر نے مجھ پر اثر کیوں نہیں کیا — میں — میں موت کو اپنے قریب محسوس کیوں نہیں کرتا — میرا حلق بھی تو خشک نہیں ہوا۔ ہر رنگ بھی ویسے کا ویسا ہے۔

نیلم۔ اس لئے کہ تم نے زہر نہیں پیا۔

عباس: (حیرت سے) زہر نہیں پیا — جمیل کیسے مر گیا؟

نیلم مر گیا — اس کی چالاکی اور ہوشیاری اس کی مدد نہ کر سکی۔ حالانکہ میں نے دونوں کو بچانے کی کوشش کی تھی — زہر کی پڑیا کی بجائے میں نے شکر کی پڑیا بڑی پھرتی سے تمہارے ہاتھ میں دی تھی۔

عباس پہیلیاں بوجھنے کے فن سے میں بالکل کورا ہوں۔ نیلم!

نیلم: اسی لئے تم نہیں مرے تھے — اگر جمیل نے زہر پیا ہوتا۔ تو وہ شاید نہ مرتا مگر شکر نے اس پر زہر کا کام کیا — اب چھوڑو ان باتوں کو وہ کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھل جاتی ہے بارش کا شور سنائی دیتا ہے۔

نیلم: کھڑکی بند کر دو عباس — باہر رات کا اندھیرا محسوس ہوتا ہے گویا ہمیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیل کی روح اس کالی بارش میں نہا رہی ہے اف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے۔

عباس: اتنی بھیانک نہیں جتنا تمہارا سفید چہرہ ہے — (کھڑکی بند کر دیتا ہے)۔

وہ خط

جو پوسٹ نہ کئے گئے

حوا کی بیٹی کے چند خطوط جو اس نے فرصت کے وقت محلے کے چند لوگوں کو لکھے مگر ان کی وجہ کی بنا پر پوسٹ نہ کئے گئے جو ان خطوط میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

(نام اور مقام فرضی ہیں)

پہلا خط مسز کرپلانی کے نام

خاتونِ محترم

آداب عرض معاف فرمایئے گا میں یہ سطور بغیر تعارف کے لکھ رہی ہوں۔ مگر چند ضروری باتیں آپ سے کہنا ہیں۔ آپ کو میں ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ہر روز ساڑھے آٹھ بجے جب میں بستر سے اٹھ کر بالکنی میں آتی ہوں تو آپ کو بازار سے میرے واپس آتے دیکھا کرتی ہوں مجھے تعجب ہے کہ مسٹر کرپلانی جنہیں ساڑھے آٹھ بجے گھر سے دفتر پہنچنے کیلئے نکل جانا ہوتا ہے، صرف بڈھی نوکرانی کی موجودگی اور آپ کی غیر حاضری میں ناشتہ کیسے کرتے ہیں۔ کپڑے کیوں کر تبدیل کرتے ہیں اور پھر آپ

کا بچہ بھی تو ہے اس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیر آپ کی صحت کے لئے مفید ہے۔ اس سیر کا اثر آپ کے شوہر پر کیا پڑے گا کیا آپ نے اس کی بات پر کچھ غور کیا ہے؟ میں نے پرسوں مسٹر کرپلانی کو دیکھا۔ ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ آپ نے سر پہ ہیٹ الٹا رکھا تھا۔ اور اگر میری نگاہوں نے دھوکہ نہیں دیا تو آپ کے بوٹ کا ایک تسمہ کھلا ہوا تھا۔ جو بار بار ان کے پاؤں میں الجھ رہا تھا۔ کل بھی آپ کی حالت ایسی ہی تھی، ان کی پتلون۔ شکنوں سے بھرپور تھی، اور ٹائی کی گرہ بھی درست نہیں تھی۔

اگر آپ کی صبح کی سیر اسی طرح جاری رہی تو مجھے اندیشہ ہے ایک روز مسٹر کرپلانی اس افراتفری میں دفتر کا رخ کریں گے کہ راہ چلتی عورتوں کو اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں گی۔

اور ہاں دیکھئے کل آپ نے جو ساڑھی پہن رکھی تھی وہ آپ کی نہیں ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسز ایڈوانی نے یہ ساڑھی پچھلی دیوالی پر خریدی تھی۔ دوسروں کے کپڑے پہننا بہت معیوب ہے آپ کے پاس کم از کم بیس ۲۰ ساڑھیاں موجود ہیں۔ مسز ایڈوانی کی ساڑھی مستعار لے کر آپ نے کیوں پہنی یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔

ایک بات اور وہ یہ کہ آپ پر آستینوں کا بلاؤز اچھا معلوم نہیں ہوتا آپ کے کاندھوں پر ضرورت سے زیادہ گوشت ہے جس

کی نمائش آنکھوں پر بہت گراں گذرتی ہے آپ کے جسم پر یہ عیب آستینوں والے بلاؤز میں چھپ جاتا ہے اس لئے آپ کو ہمیشہ اسی تراش کا بلاؤز پہننا چاہیئے۔

اونچی ایڑی کا شوز آپ کیوں پہنتی ہیں۔ آپ کا قد ماشا اللہ کافی اونچا ہے۔ پرسوں آپ نے غیر معمولی ایڑی کا سینڈل پہن رکھا تھا۔ معاف فرمائیے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پیروں کے ساتھ اسٹول بندھے ہوئے ہیں اونچی ایڑی کا جوتا پہن کر آپ آسانی سے چل بھی نہیں سکتیں۔

خواہ مخواہ اپنے آپ کو کیوں تکلیف دیتی ہیں۔

آپ کی ......

دوسرا خط مسز ایڈوانی کے نام

محترم بہن!

تسلیمات، میں نے پچھلے دنوں آپ کو بانداہ میٹ پر چند سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا، آپ نے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ساڑی پہن رکھی تھی، بورڈر کے بغیر بلاؤز کالی ساٹن کا تھا کھلے گلے کا آستینوں کے بغیر گلے پر زرد رنگ کی ساٹن کا پاٹنگ تھا اور سامنے سینے پر اسی رنگ کا پھول۔ پاؤں میں آپ کے سنہری سینڈل تھی۔ چھاتا سیاہ رنگ کا تھا جس کی موٹھ زرد رنگ کے سیلو لائیڈ کی تھی۔ کالے بالوں کا

نیلا ربن تھا۔ سیاہی اور زردی کا یہ میل مجھے بہت پسند آیا تھا آپ کے ذوق کی میں بے حد معترف ہوں، رنگوں کے صحیح احترام کا آپ خوب سلیقہ رکھتی ہیں۔ مگر کل آپ جو بس سے اتریں تو مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ آپ نے کالی ساڑھی کے ساتھ بھوسلے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا ہے۔ آپ کے بالوں میں نیلا ربن گندھا ہے۔ اور سفید کینوس کا پہن رکھا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی اعلیٰ ذوق رکھنے والی خاتون نے کیوں کر ایسے بھونڈے لباس میں باہر نکلنا گوارا کیا اور پھر غضب یہ ہے کہ آپ بس میں کہیں دور گئی تھیں۔ آئندہ اگر میں نے آپ کو ایسے بے تکے لباس میں دیکھا تو مجھے اتنا صدمہ ہوگا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔

ایک بات اور سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کی نوکرانی اتنا سنگھار کیوں کرتی ہے؟ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ برس ہے۔ بظاہر وہ کنواری ہے۔ اس عمر میں اور خاص کر کنوارے پنے میں اس کا یوں بن سنور کر سودا سلف لینے بازار سے نکلنا اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ اس کا آپ کے گھر میں اپنے سنگھار پر توجہ دینا ہے۔ آپ عموماً گھر سے باہر نکلتی ہیں اور مسٹر ایڈوانی چونکہ دفتر نہیں جاتے۔ اس لئے وہ اکثر گھر ہی میں رہتے ہیں۔

آپ کی غفلت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے میں اس سے

زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی ۔

میرا خیال ہے آپ کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے ۔ اگر آپ چشمہ پہنا کریں تو عیب بالکل دور ہو جائے گا ۔ کیونکہ شیشوں میں سے یہ معمولی فرق نظر نہ آئیگا ۔

ہاں آپ سہیلیوں کو اپنی ساڑھیاں پہننے کے لئے کیوں دیدیتی ہیں ۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بدعت معاشرتی نقطہ نظر سے بری ہے اس کے علاوہ خواہ سہیلیاں کتنی ہی محتاط ہوں ، مستعار کپڑے کو نہایت بے دردی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں اگر آپ کو یقین نہ ہو تو اس سفید ساڑھی کو غور سے دیکھئے جو آپ نے مسز کرپلانی کو پہننے کے لئے دی تھی ۔ اس کا تلے کا کام کئی جگہ سے اکھڑ گیا ہے ۔

بازار میں چلتے وقت آپ بار بار ساڑھی کا پلو نہ سنبھالا کریں مجھے اس سے بڑی الجھن پیدا ہوتی ہے ۔

آپ کی ۔۔۔۔۔۔

تیسرا خط مسٹر ایوب خان انسپکٹر پولیس کے نام

مکرمی محترمی

سلام مسنون ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا ۔ کہ آپ دن میں دو بار اپنی داڑھی منڈوانا چھوڑ دیں ۔ میں سمجھتی ہوں کہ نارمل آدمی کی داڑھی کے بال نارمل حالت میں اتنی جلدی کبھی نہیں اگتے پولیس اسٹیشن جاتے

ہوتے اور وہاں سے شام کو آتے ہوئے آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ سیلون میں داخل ہو جائیں میرا خیال ہے کہ MANTA آپ کو ہو گیا ہے - اگر آپ کا دماغی توازن درست ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دن میں دو بار صبح و شام اپنی داڑھی پر استرا پھرائیں کیا سیلون کا نائی آپ کی اس عجیب وغریب حالت پر زیرِ لب کبھی نہیں مسکرایا ؟

اور پھر یہ آپ اپنے بال کس طور سے کٹواتے ہیں - واللہ بہت پرانے معلوم ہوتے ہیں - گردن سے لے کر کھوپڑی کے بالائی حصے تک آپ بالوں کا صفایا کرا دیتے ہیں اور کانوں کے اوپر تک باریک مشین پھروا کر آخر آپ کیا فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں - حضرت آپ کی گردن بہت بھدی ہے اور آپ کے سر کے نچلے حصے پر پھوڑوں کے نشان ہیں جو صرف بال ہی چھپا سکتے ہیں اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ بار بار مونڈنے سے آپ کی گردن موٹی ہو جائے گی - آپ کے کان بہت بڑے ہیں - جس قسم کی حجامت کا آپ کو شوق ہے اس سے یہ اور بھی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں میری رائے ہے کہ آپ قلمیں رکھیں اور کانوں کے قریب سے بال نہ کٹوائیں - گردن پر اگر آپ تھوڑے سے بال اگنے دیں تو کوئی حرج نہیں - اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی -

ہاتھ میں چھڑی لے کر جب بازار میں چلتے ہیں تو دماغ میں اس خیال کو جگہ نہ دیا کریں کہ ہر اسکول کی جانے والی لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے کسی شائستہ مزاج لڑکی کی آنکھیں آپ کی طرف نہیں اٹھ سکتیں - اسلئے

آپ اپنے کندھوں پر ایسا بھونڈا سرا ٹھائے ہوئے ہیں جس کو آپ کے ایجاد کردہ فیشن نے اور بھی زیادہ بدنما بنا رکھا ہے۔

بار بار آپ اپنے کوٹ سے کیا جھاڑا کرتے ہیں؟ کیا گرد و غبار کے ذرّے صرف آپ ہی کے کوٹ پر آکر بیٹھتے ہیں، یا پھر آپ حد سے زیادہ ہیں۔ نفاست پسند ہیں۔؟

کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ چالیس برس کے ہونے پر بھی آپ کنوارے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اس سے آپ کو عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔ میرا مشورہ لیجئے اور دن میں دو بار سیلون جا کر داڑھی منڈوانا چھوڑ دیجئے خدا آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپ کی مخلص.....

چوتھا خط مس ڈی سلوا کے نام!

ڈیئر مس ڈی سلوا۔

تمہاری حالت پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ تم روز بروز موٹی ہو رہی ہو۔ اگر تمہارا موٹاپا اسی رفتار سے بڑھتا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تم کسی مرد کے قابل نہ رہو گی۔ اسکول جانے کے لئے جب تم "جم" پہن کر گھر سے نکلتی ہو تو میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہوتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ کرسمس تم ڈانس کس طرح کر سکو گی ایک دو قدموں ہی میں تمہارا پسینہ چھوٹ جائیگا اور تمہارا ساتھی کیوں کر تمہاری باہوں کو حسب منشا

حرکت میں لا سکے گا۔ تمہاری بغلوں کے نیچے گوشت اس قدر جمع ہو رہا ہے کہ تم ڈانس کرنے کے بالکل قابل نہیں رہی ہو۔ خدا کے لئے اپنا علاج کراؤ اور اس موٹاپے کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرو۔

ایک نصیحت میری اور سن لو، شام کو تم ہر روز ٹیرس پر اکیلی جاتی ہو اور سامنے والے مکان پر ڈی کوسٹا کے بڑے لڑکے کو اشارے کرتی رہتی ہو اوّل تو یہ شریف لڑکیوں کا کام نہیں دوسرے یہ اشارے چربی بھرے گوشت کے مانند بھدے اور بے لذت ہوتے ہیں تم جیسی لڑکیوں کو ایسی اشارہ بازی نہیں کرنی چاہیئے اس لئے کہ اشارہ ایک لطیف یعنی باریک اور پتلی چیز کا نام ہے تمہارے اشارے، اشارے نہیں ہوتے ان کے لئے مجھے کوئی اور نام تلاش کرنا ہوگا۔

جس لونڈے کے ساتھ تم رومان لڑانا چاہتی ہو اس کے متعلق بھی سن لو۔ وہ ایک آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ ڈھائی مہینے سے کالی کھانسی میں مبتلا ہے ماں باپ نے ناقابلِ اصلاح سمجھ کر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے اس کے پاس صرف تین پتلونیں ہیں جن کو بدل بدل کر پہنتا ہے ہر روز اپنی قمیض اور پتلون پر دوبارہ استری کرتا ہے۔ تاکہ باہر کے لوگوں کی نظر میں اس کی وضعداری قائم رہے مجھے ایسے آدمیوں سے نفرت ہے۔

تم اپنی پنڈلیوں کے بال استرے سے نہ مونڈا کرو، بال اڑانے کے سب پاؤڈر اور سب کریمیں بھی فضول ہیں۔ بال کبھی ہمیشہ کے لئے غائب نہیں ہو سکتے اس لئے تم اپنی پنڈلیوں پر ظلم نہ کرو۔ بال رہنے دو۔ لمبی

جرابیں پہنا کرو۔

تمہارا دوست، آج دوپہر کو اپنا پھٹا ہوا جوتا خود مرمت کر رہا تھا۔

تمہاری خیر خواہ ......

پانچواں خط کوشلیا دیوی کے نام!

شریمتی کوشلیا دیوی۔ نمسکار!

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے گھر میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ آرام دہ لباس پہنے اور تکلفات سے آزاد رہے۔ مگر دیوی جی آپ۔ ململ کی باریک دھوتی پہن کر اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں اور پھر آپ یہ دھوتی کچھ اس بے تکلفی سے پہنتی ہیں کہ جب آپ اتفاق سے نظر آجائیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ آپ کو کس زاویے سے دیکھا جائے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ روشنی کے سامنے کھڑے ہونے سے آپ کی دھوتی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ آپ کی عمر اس وقت چالیس برس کے قریب، عمر کی اس زیادتی نے آپ کے جسم کو بالکل ڈھیلا کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ باریک دھوتی میں سے آپ کی بھدی ٹانگوں کی نمائش آنکھوں پر گویا "بجلی" بن کر رہ جاتی ہے۔

آپ نے فلیٹ کا دروازہ عام طور پر کھلا رکھتا ہے اور میں اکثر دیکھتا ہوں کہ باورچی خانہ کے پاس بھی دھوتی پہنے دیکھ رہی ہیں۔ اگر آپ کو دھوتی کا استعمال ترک نہیں کرنا ہے تو براہ کرم اپنے فلیٹ کا دروازہ

بند رکھا کریں۔

آپ کی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

چھٹا خط مسٹر سعید حسین جرنلسٹ کے نام!

جنابِ من تسلیم!

آپ ہر روز صبح بالکونی میں پتلون پہنتے ہیں۔ آپ کا یہ فعل کمیونزم کی بدترین مثال ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خط آپ پڑھ کر ضرور شرمسار ہوں گے اور آئندہ سے پتلون شریف آدمیوں کی طرح اپنے کمرے میں پہنا کریں گے۔

مخلص۔

مکرر: آپ کے بال بہت بڑھ گئے ہیں سیلون آپ کے مکان کے نیچے ہے ہمت کر کے آج ہی کٹوا دیں۔

آپ کی ہمدرد ۔۔۔۔۔

ساتواں خط مسز قاسمی کے نام!

خاتون مکرم۔

السلام علیکم۔!

میں بہت عرصے سے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ مگر چند در چند وجوہ کے باعث ایسا نہ کر سکی میں نے سنا ہے کہ دو گھروں میں

نفاق پیدا کرنے کے لئے آپ کو بہت سے گر زبانی یاد ہیں۔ مسز انڈوانی اور مسز کرپلانی کے درمیان ایک دفعہ آپ ہی کی کوششوں سے رنجش پیدا ہوئی تھی اور پچھلے دنوں سیٹھ گوپال داس کی پٹ پا کے بارے میں آپ نے جو افواہیں مشہور کی تھیں ان سے سیٹھ گوپال داس اور رام داس کے گھر اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے مگر میں سوچتی ہوں کہ ابھی تک آپ کے اور مسز قانون گو کے درمیان کشیدگی پیدا کیوں نہیں ہوئی۔ اب تک آپ نے جس عورت کو سہیلی بنایا ہے اس سے تیسرے چوتھے مہینے آپ کی تُو تُو۔ میں۔ میں ضرور ہوتی ہے۔ لیکن مسز قانون گو سے آپ کی دوستی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ جو کئی برسوں کے برابر ہیں۔ میں اب زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی۔ اس مہینے مسز قانون گو سے آپ کی جھک جھک ضرور ہو جانی چاہیئے۔ آپ کو اپنی روایات برقرار رکھنی چاہیئیں۔ ہاں یہ ضرور بتائیے کہ آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ پنجاب کی رہنے والی ہیں، مگر آپ کا چہرہ نیپالیوں اور تبتیوں سے کیوں ملتا جلتا ہے؟ آپ کی ناک بالکل نیپالیوں کی طرح چپٹی ہے اور گالوں کی ہڈیاں بھی انہی کی طرح ابھری ہوئی ہیں۔ البتہ آپ کا قد ان کی طرح پست نہیں۔

آپ نے عید پر جو ساڑھی پہنی تھی مجھے پسند نہ آئی آپ کا ذوق نہایت فضول ہے۔ اگر آپ بھڑکیلے اور شوخ رنگوں کے بجائے ہلکے رنگ کے کپڑے انتخاب کیا کریں تو بہت اچھا ہے۔ لمبے قد کی عورتوں

کو بھڑی لکیروں کی نہیں پہننی چاہیئے اس سے وہ اور لمبی ہو جاتی ہیں اسی طرح آپ کو لیف سلیوز کا بلاؤز نہیں پہننا چاہیئے کیونکہ لمبے قد کی عورتوں کے لئے یہ موزوں نہیں ہوتا اور پھر آپ تو ویسے ہی دبلی پتلی ہیں - آپ کے کاندھے پر بلاؤز کے اٹھے ہوئے "پف" بہت بڑے معلوم ہوتے ہیں -

آپکی خیر اندیش.....

آٹھواں خط راجکماری کے نام!

مس راجکماری -

مجھے تم سے نفرت ہے ، تم عورت نہیں سوٹ کیس ہو -

تم سے نفرت کرنے والی -

نواں خط مسٹر صالح بھائی کنٹریکٹر کے نام!

جناب صالح صاحب! تسلیم!

مجھے آپ سے شکایت نہیں ، لیکن پھر بھی میں آپ کو پسند نہیں کرتی ہوں یہ معلوم کیا اور ہے کہ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں غیظ و غضب پیدا ہو جاتا ہے - آپ اگرچہ بہت شریف آدمی ہیں ، آپ کی شکل و صورت بھی کوئی بری نہیں - لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر آپ کو میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہوں - آپ کے چہرے پر یتیمی برستی

ہے ۔ آپ کی چال بھی نہایت قابل ستائش ہے ۔

آپ کی ہمدرد ۔ ....

دسواں خط مس رضیہ صلاح الدین کے نام !

ڈیئر مس رضیہ

سلام مسنون !

تم ابھی ابھی پنجاب کے کسی گاؤں سے آئی ہو ۔ پہلے ساڑھی پہننے کی عادت اختیار کرو پھر اس لباس میں باہر نکلو تمہیں یہ لباس پہننے کا بھی سلیقہ نہیں ہے ۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو تماشہ نہ بناؤ ۔

تمہاری خیر خواہ .....

مصری کی ڈلی

پچھلے دنوں میری روح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ روح اس لیے کہ میں نے دفعتاً اپنے ماحول کی خوفناک ویرانی کو محسوس کیا تھا اور جسم اس لیے کہ میرے تمام پٹھے سردی لگ جانے کے باعث چوبی تختے کی مانند اکڑ گئے تھے۔ دس دن تک میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا رہا۔ پلنگ — اس چیز کو پلنگ ہی سمجھیے۔ جو لکڑی کے چار بڑے پاؤں پندرہ بیس چوبی ڈنڈوں اور ڈیڑھ دو سو من وزنی مستطیل آہنی چادر پر مشتمل ہے (اہے کی یہ بھاری بھرکم چادر، نواڑ بر بنی کا کام دیتی ہے اس پلنگ کا یہ فائدہ ہے کہ کھٹمل دور رہتے ہیں اور یوں بھی کافی مضبوط ہے (یعنی صدیوں تک قائم رہ سکتا ہے۔)

یہ پلنگ میرے پڑوسی سلیم صاحب کا عنایت کردہ ہے، میں زمین پر سوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جو پلنگ انہیں کے کمرے کے ساتھ ملا تھا — مجھے دے دیا تاکہ میں سخت فرش پر سونے کے بجائے لوہے کی چادر پر آرام کروں۔ سلیم صاحب اور ان کی بیوی کو میرا بہت خیال ہے اور ان کا بہت ممنون ہوں۔ اگر میں معمولی سے معمولی چارپائی بھی بازار سے لیتا تو کم از کم چار پانچ روپے

خرچ ہو جاتے -

خیر چھوڑیئے اس قصے کو میں یہ بات کر رہا تھا کہ پچھلے دنوں میری روح اور میرا جسم دونوں علیل تھے دس دن اور دس راتیں میں نے ایسے خلا میں بسر کر دیں جس کی تفصیل بیان ہی نہیں کر سکتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کہیں ٹنگا ہوں، لوہے کے پلنگ پہ لیٹے لیٹے یوں بھی میرا جسم شل ہو گیا تھا۔ دماغ ویسے بھی منجمد تھا۔ جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں میں کیا عرض کروں میری کیا حالت تھی۔

دس دن اس ہیبت ناک خلا میں رہنے کے بعد میرے جسم کی علالت اور ہو گئی۔

دس بجے کا عمل تھا۔ دھوپ سامنے کارخانے کی بلند چمنی سے پہلو بچاتی کمرے کے فرش پر لیٹ رہی تھی۔ میں لوہے کے پلنگ پر سے اٹھا تھکے ہوئے جسم میں انگڑائی سے حرکت پیدا کرنے کی کوشش کے بعد جب میں نے کمرے کی طرف نظر دوڑائی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کمرہ وہ نہیں تھا۔ جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دائیں ہاتھ کونے میں ڈریسنگ ٹیبل تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا میز ہمارے کمرے میں ہوا کرتا تھا۔ مگر اس کا پالش اتنا چمکیلا نہیں تھا۔ اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی نہیں ہے اتنی خوبیاں نہیں دیکھی تھیں کمرے کے وسط میں جو بڑا میز پڑا رہتا تھا۔ وہ بھی مجھے نامانوس معلوم ہوا، اس کا بالائی ہشت پہلو تختہ چمک رہا تھا دیوار پر پانچ چھ تصویریں آویزاں تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

ان میں سے ایک تصویر میری نگاہ میں جم گئی۔ میں بڑھا اور اس کے قریب سے دیکھا، جدید فوٹو گرافی کا نمونہ تھا۔ ہلکے بھوسیلے رنگ کے کاغذ پر ایک جوالسال لڑکی کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے اور کانوں پر سے ادھر کو اڑ رہے تھے، سینہ سامنے سے ناف کے نیچے سے دباؤ تک ننگا، اس نرم ونازک عریاں کو اس کی باہیں جو اس کے چہرے تک اٹھی ہوئی تھیں۔ چھپانے کی دلچسپ کوشش کر رہی تھیں، پتلی پتلی لمبے لمبے ناخنوں والی انگلیوں میں سے چہرے کی فضا چھن چھن کر باہر آ رہی تھی، کہنیوں نے نیچے سے پیٹ کے اختتامی خط پر آپس میں جڑ کر ایک دلچسپ تکون بنا دی تھی جس میں سے ناف کا گدگدا گڑھا مسکرا رہا تھا۔ اگر اس چھوٹے سے گڑھے میں ڈنڈی گاڑ دی جاتی تو اس کا پیٹ سیب کا بالائی حصہ بن جاتا۔

دیر تک میں اس نیم عریاں نیم مستور شباب کو دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ تصویر کہاں سے آ گئی اس حیرت میں غرق میں غسل خانے کی طرف بڑھا کمرے کے چوتھے کونے میں نل کے نیچے فرش پر سل لگی ہوئی ہے اس کے ایک طرف چھوٹی سی منڈیر بنا دی گئی ہے۔ یہ جگہ جہاں جست کی بالٹی، صابن دانی، دانتوں کے دو برش داڑھی مونڈنے کے دو استرے صابن لگانے کی دو کوچیاں منجن کی بوتل اور پانچ چھ استعمال شدہ زنگ آلود بلیڈ پڑے رہتے ہیں۔ ہمارا غسل خانہ ہے، نذیر صاحب جن کا یہ کمرہ ہے علی الصبح بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ چنانچہ داڑھی مونڈ کر وہ فوراً ہی غسل خانے سے فارغ ہو جاتے ہیں میں سویا رہتا ہوں اور وہ مزے سے ننگے نہاتے رہتے ہیں۔ اس غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر تمام چیزوں

پر نظر ڈورائی اب مجھے وہ اسی قدر مانوس معلوم ہوئیں منڈیر پر میرا استرا اور گھر ہوا برش اسی طرح پڑا تھا جس طرح میں ہر روز دیکھا کرتا تھا بالٹی بھی بلا شک وہی تھی جو ہر روز نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ اس میں ڈونگا وہی تھا۔ جس میں جابجا گڑھوں میں میل جما رہتا تھا۔

منڈیر پر بیٹھ کر جب میں نے برش سے دانت گھسنے شروع کئے تو میں نے سوچا کہ کمرہ وہی ہے جس میں ایک سو بیس راتیں میں گذار چکا ہوں۔ راتیں میں نے غور کیا مسئلہ صاف ہو گیا۔ کمرے اور اس کی اشیاء کے نامانوس ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس میں صرف ایک سو بیس راتیں ہی گذاری تھیں صبح سات یا آٹھ بجے جلدی جلدی کپڑے بدل کر جو میں نے ایک دفعہ باہر نکلا تو پھر رات کو گیارہ بجے کے قریب ہی لوٹنا ہوتا تھا۔ اس صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ مجھے کمرے کی ساخت اور اس پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھنے کا موقعہ ملتا۔ اور پھر نہ کمرہ میرا ہے اور نہ اس کی کوئی چیز میری ملکیت ہے اور یہ بھی تو سچی بات ہے کہ بڑے شہر انسانیت کے وفن و مدفن ہوتے ہیں۔

میں جس ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہوں اس قدر یکساں اور ایک آہنگ ہے کہ طبیعت بار بار اکتا گئی ہے۔ جی چاہتا کہ شہر چھوڑ کر کسی ویرانے میں چلا جاؤں صبح صبح جلدی جلدی نہانا اور پھر عجلت میں کپڑے پہن کر دفتر میں کاغذ کالے کرتے رہنا۔ اور وہاں سے شام کو فارغ ہو کر ایک اور دفتر میں چھ سات گھنٹے اسی اکتا دینے والے کام میں مصروف رہنا۔ اور رات کے گیارہ بارہ بجے اندھیرے ہی میں کپڑے اتار کر سلیم کے دیئے ہوئے پلنگ پر سونے کی کوشش کرنا۔ ...... کیا یہ زندگی

ہے۔

زندگی کیا ہے؟ یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ادنی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائیگا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائیگا۔

جب زندگی کے لمحات کٹتے محسوس ہوں اور ہر قطعے کی تختی پر کچھ نقش چھوڑ جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے آدمی زندہ ہے اور اگر مہینوں گذر جائیں اور یہ محسوس تک نہ ہو کہ مہینے گذر گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی حیات مردہ ہو گئی ہیں۔ زندگی کی کتاب میں اگر اوپر تلے خالی اوراق ہی شامل ہوتے چلے جائیں۔ تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے۔ یا کہ نہیں اس کی بابت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں تو اس معاملے میں بہت حساس ہوں زندگی کی یہ خالی کاپی جو ہمارے ہاتھ میں تھمائی گئی ہے آخر اسی لئے تو ہے کہ اس کے ہر ورق کو ہم استعمال کریں اس پر کچھ لکھیں، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے کوئی ایسی بات ہی نہیں ملتی جس کے متعلق میں کچھ لکھوں لے دے کہ میری اس کاپی میں صرف دو تین ورق ایسے ہیں جن پر میں نقش و نگار بنے دیکھتا ہوں۔ یہ ورق مجھے کتنے عزیز ہیں اگر آپ ان کو نوچ کر باہر نکال دیں تو میری زندگی ایک بیابان بن جائیگی۔ آپ یقین کیجئے میری زندگی واقعی چٹیل میدان کی طرح ہے۔ جس میں ان بیتے ہوئے دنوں کی پرانی یاد ایک صورت قبر کی طرح لپٹی ہوئی ہے۔ چونکہ میں نہیں چاہتا کہ اچھے دنوں کی یہ سہانی یاد مٹ جائے اس لئے اس قبر پر میں ہر وقت مٹی کا لیپ کرتا ہوں۔

میرے سامنے دیوار پر ایک پرانا کیلنڈر لٹک رہا ہے۔ جس کے میلے کاغذ پر چیڑ کے لمبے لمبے درختوں کی تصویر چھپی ہے۔ میں لیٹے لیٹے ایک مدت سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے پیچھے دور بہت دور برف اپنی زندگی کے کھوئے ہوئے ٹکڑے کی جھلک نظر آرہی ہے۔

میں ایک پہاڑی کے دامن میں چیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھا ہوں۔ بگّو بڑے بھولے پن سے گھٹنے ٹیک کر اپنا سر میرے قریب لاتی ہے اور کہتی ہے آپ مانتے ہی نہیں سچ میں بوڑھی ہو گئی ہوں اب بھی یقین نہ آئے گا لیجئے میں میرے سر میں سفید بال دیکھ لیجئے۔

چودہ برس کی دیہاتی فضا میں پلی ہوئی جوان لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ معلوم نہیں وہ کیوں اس بات پر زور دینا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ مجھ سے یہ بات کہہ چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جوان آدمی کو شباب کے دائرے سے نکل کر بڑھاپے کے دائرے میں داخل ہونے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ میرے دل میں بھی اس قسم کی خواہش کئی بار پیدا ہو چکی ہے۔ میں نے متعدد بار سوچا کہ میری کنپٹیوں پر اگر سفید بال نمودار ہو جائیں تو چہرے کی متانت اور سنجیدگی میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔ کنپٹیوں پر اگر سفید بال ہو جائیں تو چاندی کے مہین تاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ اور دوسرے سیاہ بالوں کے درمیان بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بگّو یہی چاہتی ہو کہ اس کے بال سفید ہو جائیں اور وہ اپنی کم عمری کے باوجود بوڑھی دکھائی دے۔
میں نے اس کے خشک مگر نرم بالوں میں کنگھی کرنا شروع کی اور کہا تم بوڑھی

نہیں ہو سکتیں۔

اس لئے کہ تم میں آس پاس کے درختوں پہاڑوں اور ان کے بہتے ہوئے نالوں کی ساری جوانی جذب ہو گئی ہے۔

وہ قریب سے قریب سرک آئی اور کہنے لگی جانے آپ کیا کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں، ابھی میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ درختوں اور پہاڑوں کی بھی جوانی ہوتی ہے۔

اس نے سر اٹھا کر پوچھا کیوں؟ میں کیوں بوڑھی نہیں ہو سکتی۔

تمہاری سمجھ میں آئے نہ آئے پر میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔

بہت اچھا کیا آپ نے ..... پر آپ میرے بالوں میں اس طرح کرتے رہیں جو نے اپنے ہاتھ سے سر کو کھجلاتے ہوئے کہا۔ مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔

بہت اچھا جناب، کہہ کر میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کو مزہ آ رہا تھا لیکن مجھے خود بھی مزہ آنے لگا۔ میں یہ سمجھنے لگا کہ اس کے بال میرے الجھے ہوئے خیال ہیں۔ جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔

دیر تک اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا، وہ خاموشی سے سر جھکائے لیٹی رہی پھر اس نے اپنی خمار آلود نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور نیند میں بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ میں اگر سو گئی تو؟

میں جاگتا رہوں گا۔

نیم خوابیدہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پیدا ہوئی اور وہ زمین پر وہیں میرے

سامنے لیٹ گئی، تھوڑی دیر کے بعد نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔
بیگو سو رہی تھی مگر اس کی جوانی جاگ رہی تھی جس طرح سمندر کی پر سکون سطح کے نیچے گرم لہریں دوڑتی رہتی ہیں، بائیں بازو کو سر کے نیچے رکھے اور ٹانگوں کو اکٹھا کئے وہ سو رہی تھی، اس کا ایک بازو میری جانب سرکا ہوا تھا، میں اس کی پتلی انگلیوں کی مخروطی تراش دیکھ رہا تھا، کہ ان میں خفیف سی کپکپاہٹ پیدا ہوئی جیسے مردہ مچھلیاں ارتعاش پذیر ہو جائیں، یہ ارتعاش اس کی انگلیوں سے شروع ہو کر اس کے سارے جسم پر پھیل گئی۔ جس طرح تالاب میں پھینکی ہوئی کنکری اس کی آبی سطح پر ایک چھوٹا سا بھنور پیدا کرتی ہے۔ اور یہ بھنور دائرے بناتا ہوا پھیلتا چلا جاتا ہے، اسی طرح وہ کپکپاہٹ اس کی انگلیوں سے شروع ہو کر اسکے سارے جسم پر پھیل گئی نہ جانے اس کی جوانی کیسے ارتعاش پیدا کرنے والے خواب دیکھ رہی تھی۔
اس کے نچلے ہونٹ کے کونوں میں تھرتھراہٹ کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی اس کے سینے کے ابھار میں دل کی دھڑکنیں زندگی پیدا کر رہی تھیں۔ گریبان کے نچلے دو بٹن کھلے تھے اس طرح جسم سے ساری نقاب اٹھ گئی تھی۔ اور دو نہایت ہی پیاری قوسیں باہر جھانک رہی تھیں۔ سینے کی ننھی سی وادی میں دونوں طرف کے ابھار بڑی خوبصورتی سے آپس میں گھل مل گئے تھے۔
میری نگاہ اس کے سینے پر کرتے کی ایک طرف بنی ہوئی جیب پر رک گئی اہمیں خدا معلوم کیا کچھ بیگو نے ٹھونس رکھا تھا کہ وہ ایک گیند سی بن گئی تھی۔
میرے دل میں دفعتاً یہ معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں آہستہ سے اس کی جیب کی تلاشی لینے کا ارادہ کیا تو وہ جاگ اٹھی سیدھی لیٹ کر اس نے

دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں لمبی لمبی پلکیں جو آپس میں ملی ہوئی تھیں ۔ تھرتھرائیں اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم نے انگڑائی لی اور کہا :- آپ بڑے وہ ہیں ۔

کیوں میں نے کیا کیا ہے ۔

وہ اٹھ بیٹھی ۔ ابھی آپ نے کچھ کیا ہی نہیں میں سچ مچ سو گئی اور آپ نے جگانے تک کی تکلیف نہ کی ۔ میں اگر ایسے ہی شام تک سوئی رہتی تو ؟ اس نے آنکھوں کی پتلیاں نچائیں اور دفعتاً کچھ یاد کر کے کہا ۔ ہائے میرے اللہ میں اپنی جان ہیر کو بھی بھول گئی ۔

سامنے پہاڑی پر اگی ہوئی سبز جھاڑیوں کی طرف جب اس نے دیکھا تو اطمینان کا سانس لیکر کہا کتنی اچھی ہے میری ہیر ۔

اس کو اپنی بھینس کی فکر تھی جو ہمارے سامنے پہاڑی پر گھاس چر رہی تھی ۔

میں نے اس سے پوچھا تمہاری ہیر تو موجود ہے پر رانجھا کہاں ہے ۔

رانجھا اس کے لب مسکراہٹ کے ساتھ کھلے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی اور پھر کھکھلا کر ہنس پڑی رانجھا ۔

رانجھا ..... رانجھا اس نے یہ لفظ کئی مرتبہ دوہرایا ، میری ہیر کا رانجھا .... مجھے کیا معلوم نگوڑا کہاں ہے ۔

میں نے کہا تمہاری ہیر کا کوئی نہ کوئی رانجھا تو ضرور ہوگا ۔ مجھ سے چھپانا چاہتی ہو تو یہ الگ بات ہے ۔

اس میں چھپانے کی بات ہی کیا ہے ۔ بیگو نے آنکھیں مٹکا کر کہا اور اگر کوئی

ہے تو ہیر کو معلوم ہوگا چاہیے اس سے پوچھ لیجئے پر کان میں کہے گا اور آہستہ سے
کہے گا۔ بتاؤ تمہارا رانجھا کہاں ہے۔

رانجھا میں نے پوچھ لیا۔

کیا جواب ملا؟

بولی بیگو سے پوچھ لو، وہی سب کچھ جانتی ہے۔

جھوٹ — جھوٹ اس کا اوّل جھوٹ اس کا آخر جھوٹ، بیگو بچوں کی طرح
اچھل اچھل کر کہنے لگی۔ میری ہیر تو بڑی شرمیلی ہے ایسے سوالوں کا وہ کبھی جواب
دے ہی نہیں سکتی آپ جھوٹ بولتے ہیں اس نے آپ کو غصّے میں کہا تھا چلو ہٹو
کنواریوں سے ایسی باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی۔
یہی کہا تھا اور اس کا جواب یوں ملا۔ یہ تمہارا بچھڑا کہاں سے آگیا ہے کیا آسمان
سے ٹپک پڑا تھا۔

بگو یہ بچھڑے والی بات سن کر لاجواب ہوگئی مگر چونکہ وہ لاجواب ہونا نہیں
چاہتی تھی اس لئے بکا رچلانا شروع کر دیا۔ جی ہاں آسمان سے ہی بھولی۔۔۔
اس بچھڑے کو تو میری ہیر نے گود لیا ہے، یہ اس کا بچہ نہیں کسی اور کا ہے اب
بتائیے آپ کے پاس کیا جواب ہے۔

میں نے ہار مان لی اس لئے کہ میری نگاہیں پھر اس کی ابھری ہوئی
جیب پر پڑی جس میں خدا معلوم کیا کچھ ٹھونسا ہوا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ہار
گیا۔ آپ کی ہیر کنواری ہے۔

دنیا کی سب بھینسیں گائیں کنواریاں ہیں۔ میں کنوارا ہوں۔ آپ کنواری

ہیں ــــ لیکن یہ بتائیے کہ آپ کی اس کنواری جیب کو کیا ہو گیا ہے۔

اس نے اپنی پھولی ہوئی جیب دیکھی تو میری طرف انگلی دبا کر ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا، آپ کو شرم نہیں آتی۔ کیا ہو لیا ہے۔ میری جیب کو میری چیزیں پڑی ہیں اس میں۔

چیزیں ۔۔۔۔۔ اس سے تمہارا مطلب۔

آپ تو بال کی کھال اتارتے ہیں۔ چیزیں پڑی ہیں میرے کام کی اور کیا میں نے پتھر ڈال رکھے ہیں۔

میں پوچھ سکتا ہوں۔

یہ کام کی چیزیں کیا ہیں ؟

آپ ہرگز نہیں پوچھ سکتے۔ اگر آپ پوچھیں بھی تو میں نہیں بتاؤں گی اس واسطے کہ آپ نے مجھے اپنے چمڑے کے تھیلے کی چیزیں کب دکھائی ہیں میں اگر آپ سے کہوں بھی تو آپ کبھی نہ دکھائیں گے۔

میں ایک ایک چیز دکھانے کے لئے تیار ہوں۔

یہ رہا تھیلا میں نے اپنے چرمی تھیلے اس کے سامنے رکھ دیا خود کھول کر دیکھ لو۔ مگر یاد رہے کہ مجھے اپنی جیب کی سب چیزیں تمہیں دکھانی پڑیں گی۔

پہلے میں اس تھیلے کی تلاشی تو لے لوں۔ یہ کہہ کر اس نے میرا تھیلا کھولا اور اس کی سب چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ انگریزی کا ایک ناول کاغذوں کا پیڈ، دو پنسلیں، ایک ربڑ دس بارہ لفافہ اور آٹھ آنے والے سٹیمپ دار لفافہ اور لکھے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ یہ میری چیزیں تھیں۔

جب وہ ایک ایک کرکے اچھی طرح دیکھ چکی تو میں نے اس سے کہا اب اپنی جیب کا منہ ادھر کر دیجئے۔

اس نے میری بات کا جواب نہ دیا تھیلے کی تمام چیزیں رکھنے کے بعد اس نے تھکانہ لہجہ میں کہا اب اپنی جیب دکھائیے۔

میں نے اپنی جیب کا منہ کھول دیا اس نے ہاتھ ڈال کر اس میں جو کچھ بھی تھا باہر نکال لیا ایک بٹوہ اور چابیوں کا گچھا تھا جس میں چھوٹا سا چاقو بھی شامل تھا۔ یہ چاقو گچھے میں سے نکال کر اس نے ایک طرف زمین پر رکھ دیا اور باقی چیزیں مجھے واپس دیدیں۔

یہ چاقو میں نے لے لیا ہے۔ کپڑے کاٹنے کے کام آئیگا۔

لے لو پر مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔۔۔ میں جب تک تمہاری جیب کی ایک ایک چیز نہ دیکھ لوں۔ چھوڑوں گا نہیں۔

اگر میں نہ دکھاؤں تو ــــ

لڑائی ہو جائیگی۔

ہو جائے ہمیں تھوڑی ڈر جاؤں گی، یہ کہہ کر فوراً ہی اپنے دوپٹے کا تنبو بنا کر اس میں چھپ گئی اور جیب میں سے چیزیں نکالنے لگی اس پر میں نے رعب دار آواز میں کہا۔ دیکھو یہ بات ٹھیک نہیں تم کچھ چھپا رہی ہو۔

آپ مان لیجئے میں سب کچھ دکھاؤں گی اللہ کی قسم سب چیزیں ایک ایک کرکے دکھا دونگی ــــ یہ تو میں اپنا من سمجھانے کے لئے کر رہی ہوں۔

وہ چیزیں نکال نکال کر ڈالتی رہی۔

اور

اس نے پھر رعب دار آواز میں کہا، کیا کر رہی ہو میں تمہاری سب چالاکیاں سمجھتا ہوں، سیدھے من سے تمام چیزیں دکھا دو ورنہ میں زبردستی سب کچھ دیکھ لوں گا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ڈوپٹے سے باہر نکل آئی اور آگے بڑھ کر کہنے لگی

• دیکھ لیجئے "

میں اس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی والا تھا کہ اس کے تنے ہوئے سینے کو دیکھ کر رک گیا، تم خود ہی ایک ایک چیز نکال کر دکھاتی جاؤ۔۔۔۔۔۔۔

تو اتنا لحاظ میں تمہارا کئے دیتا ہوں۔ یوں تمہاری ایمانداری بھی معلوم ہو جائے گی۔

• نہیں آپ خود نکالتے جائیے بعد میں آپ کہیں گے کہ میں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں۔

میں دیکھ جو رہا ہوں۔ تم نکالتی جاؤ۔

جیسے آپ کی مرضی یہ کہہ کر آہستہ سے اس نے اپنی جیب میں دو انگلیاں ڈالیں اور سرخ رنگ کے ریشمیں کپڑے کا ایک ٹکڑا باہر نکالا اس پر میں نے پوچھا۔ کپڑے کا یہ بیکار سا ٹکڑا تم ساتھ ساتھ کیوں لئے پھرتی ہو۔

جی آپ کو کیا معلوم یہ بہت بڑھیا کپڑا ہے میں اس کا رومال بناؤں گی۔ جب بن جائیگا تو پھر آپ دیکھئے گا۔ یہ کہہ کر اس نے کپڑے کا ٹکڑا اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ پھر جیب سے کچھ نکالا اور بند مٹھی میرے بہت قریب لا کر کھول دی سیلولائیڈ کے تین مستعمل کلپ۔ ایک چابی اور سیپ کے

دو بٹن اس کی ہتھیلی پر مجھے نظر آئے۔

میں نے اس سے کہا۔ یہ اپنی جھولی میں رکھ لو اور باقی چیزیں جلدی جلدی نکالو۔

اس نے جیب میں جلدی جلدی ہاتھ ڈال کر باری باری چیزیں باہر نکالیں سفید دھاگے کی گولی اس میں پھنسی ہوئی زنگ آلود سوئی۔ لکڑی کی میلی کچیلی کنگھی چھوٹا سا آئینہ اور ایک پیسہ،

میں نے اس سے پوچھا کوئی چیز باقی تو نہیں رہی۔

جی نہیں اس نے اپنے سر کو جنبش دی سب چیزیں آپ کے سامنے رکھ دی ہیں اب کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

غلط میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا۔ تم جھوٹ بولتی ہو جھوٹ بھی ایسا بولتی ہو جو بالکل کچا ہو۔ ابھی ایک چیز باقی ہے جونہی یہ لفظ میری زبان سے نکلے غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں یک لخت اپنے دوپٹے کی طرف مڑیں، میں نے تاڑ لیا کہ اس نے کچھ چھپا رکھا ہے۔ بگو سیدھے من سے مجھے یہ چیز دو جو تم نے چھپائی ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ وہ تنگ کروں گا جو عمر بھر یاد رکھو گی۔ گدگدی ایسی چیز ہے کہ۔

گدگدی کے تصور نے اس کے جسم کو اکٹھا کر دیا وہ سکڑ سی گئی اس پر میں نے ہوا میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں نچائیں یہ انگلیاں ایسی گدگدی کر سکتی ہیں کہ جناب کو پہروں بھی ہوش نہ آئیگا۔

وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمیں کپڑے کا تھان

نکال کر نیچے پھینک دیا ہے۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ خدا کے لئے کہیں ایسا بھی نہ کر دیجئے گا۔۔۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔

جب میں سچ مچ اپنے ہاتھ اس کے کندھوں تک لے گیا تو بے تحاشہ چیختی، ہنستی اور سمٹتی سمٹاتی اٹھی اور بھاگ گئی۔۔۔۔۔ ڈوپٹے میں سے کوئی چیز گری اور جو میں نے دوڑ کر اٹھالی۔ مصری کی ایک ڈلی تھی جو وہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔۔۔۔۔۔ جانے کیوں؟

ماتمی جلسہ

رات رات میں یہ خبر شہر کے ہر کونے تک پھیل گئی کہ اتاترک مر گیا ریڈیو کی تھرتھراتی زبان سے یہ سنسنی خیز پھیلانے والی خبر ایرانی ہوٹلوں میں ٹے بازوں نے سنی جو چائے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے نمبر کے بارے میں قیاس دوڑا رہے تھے۔ اور وہ سب کچھ بھول کر کمال اتاترک کی بڑائی میں گم ہو گئے۔

ہوٹل میں سفید پتھر والے میز کے پاس بیٹھے ہوئے ایک اسٹوری نے اپنے ساتھی سے یہ خبر سن کر لرزاں آواز میں کہا۔ مصطفیٰ کمال مر گیا۔

اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی —— کیا کہا مصطفیٰ کمال مر گیا۔

اس سے دونوں میں اتاترک کمال کے متعلق بات چیت شروع ہو گئی ایک دوسرے سے۔ کیا افسوس کی بات ہے۔ اب ہندوستان کا کیا ہوگا ہے

میں نے سنا تھا یہ مصطفےٰ کمال یہاں حملہ کرنے والا ہے ——— ہم آزاد ہو جاتے ہیں مسلمان قوم آگے بڑھ جاتی ——— افسوس تقدیر کے ساتھ کسی کی پیش نہیں چلتی ———

دوسرے نے جب یہ باتیں سنیں تو اس کے روئیں بدن پر چیونٹیوں کی طرح سرکنے لگے۔ اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی اس کے دل میں جو پہلا خیال آیا وہ یہ تھا۔ مجھے کل جمعہ سے نماز شروع کر دینی چاہیئے۔

اس خیال کو بعد میں اس نے مصطفےٰ کمال پاشا کی شاندار مسلمانی اور بڑائی میں تحلیل کر دیا۔

بازار کی ایک تنگ گلی میں دو تین کوکین فروش گھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے ایک نے پان کی پیک بڑی صفائی سے بجلی کے کھمبے پر پھینکی اور کہا میں مانتا ہوں مصطفےٰ کمال بہت بڑا آدمی تھا لیکن محمد علی بھی کسی سے کم نہیں تھا یہاں بمبئی میں تین ہوٹلوں کا نام اسی پر رکھا گیا ہے۔

دوسرے نے جو اپنی ننگی پنڈلیوں پر سے ایک کھردرے چاقو سے میل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا ——— "محمد علی کی موت پر بڑی شاندار ہڑتال ہوئی تھی ———!"

ہاں بھئی تو کل ہڑتال ہو رہی ہے کیا ———" تیسرے نے ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دیا اس نے جواب دیا کیوں نہ ہو گی ——— ارے اتنا بڑا مسلمان مر جائے تو ہڑتال نہ ہو۔ یہ بات ایک راہگیر نے سنی ——— اس نے دوسرے چوک میں اپنے دوستوں سے کہی ۔۔۔ اور ایک گھنٹے میں ان سب لوگوں

کو جو دن کو سوتے اور رات کو بازاروں میں جاگتے رہنے کے عادی ہیں معلوم ہو گیا کہ صبح ہڑتال ہو رہی ہے۔

ابو قصائی رات کو دو بجے کھولی میں آیا اس نے آتے ہی طاق پر سے بہت سی چیزیں ادھر ادھر پلیٹ کرنے کے بعد ایک پڑیا نکالی اور ایک دیگچی میں پانی بھر کر اس کو اس میں ڈال کر گھولنا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی جو دن بھر کی تھکی تھی ایک کونے میں پڑی ٹاٹ پر سو رہی تھی برتن کی رگڑ سن کر جاگ پڑی اس نے لیٹے لیٹے کہا۔ "آ گئے ہو۔"

"ہاں آ گیا ہوں ۔۔۔" یہ کہہ کر ابو نے اپنی قمیض اتار کر دیگچی میں ڈال دی اور اسے پانی کے اندر مسلنا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی نے پوچھا ۔۔۔ "تم یہ کیا کر رہے ہو ۔۔۔ مصطفیٰ کمال مر گیا ہے کل ہڑتال ہو رہی ہے۔ اس کی بیوی یہ سن کر گھبراہٹ کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی "کیا مارا ماری ہو گی ۔۔۔ میں تو ان ہر روز کے فسادوں سے تنگ آ گئی ہوں" وہ سر پکڑ کر رہ گئی۔ میں نے تجھ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ تو ہندوؤں کے اس محلے سے اپنا مکان بدل ڈال پر نہ جانے تو کب سنے گا۔

ابّو جواب میں ہنسنے لگا۔ "اری پگلی ۔۔۔۔۔۔ یہ ہندو مسلمان کا فساد نہیں ہے۔ مصطفیٰ کمال مر گیا ہے ۔۔۔۔۔۔ "ہی جو بہت بڑا آدمی تھا۔ کل اس کے سوگ میں ہڑتال ہو گی۔"

جانے میری بلا یہ بڑا کون آدمی ہے ۔۔۔ پر یہ تو کیا کر رہا ہے ۔۔۔ بیوی نے پوچھا سوتا کیوں نہیں ہے ۔۔۔ قمیض کو کالا رنگ دے

رہا ہوں صبح ہمیں ہڑتال کرانے جانا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے قمیض نچوڑ کر دو کیلیوں کے ساتھ لٹکادی جو دیوار میں گڑی ہوئی تھی۔

دوسرے روز صبح کو سیاہ پوش مسلمانوں کی ٹولیاں کالے جھنڈے لئے بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں —— یہ سیاہ پوش مسلمان دوکانداروں کی دوکانیں بند کرا رہے تھے اور یہ نعرہ لگا رہے تھے —— انقلاب زندہ باد انقلاب زندہ باد ——"

ایک ہندو نے جو اپنی دوکان کھولنے کے لئے جا رہا تھا یہ نعرے سنے اور نعرے لگانے والوں کو دیکھا تو وہ چپ چاپ ٹرام میں بیٹھ کر وہاں سے کھسک گیا دوسری ہندو اور پارسی دوکانداروں نے جب مسلمانوں کے ایک گروہ کو چیختے چلاتے اور نعرے مارتے دیکھا تو انہوں نے جھٹ پٹ دوکانیں بند کر لیں ——

دس پندرہ سیاہ پوش گپیں ہانکتے ایک بازار سے گزر رہے تھے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ دوست ہڑتال تو خوب ہو گئی ہے پر ویسی نہیں ہوئی جیسی محمد علی کی ٹیم پر ہوئی تھی ٹرامیں تو اسی طرح چل رہی ہیں۔"

اس ٹولی میں جو سب سے جوشیلا تھا اور جس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا تنک کر بولا۔ آج بھی نہیں چلیں گی یہ کہہ کر وہ اس ٹرام کی طرف بڑھا جو کھڑی کے ایک سٹینڈ کے نیچے مسافروں کو اتار رہی تھی ٹولی کے باقی آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اور ایک لمحہ کے اندر سب کے سب ٹرام کی سرخ گاڑی کے ارد گرد تھے۔ سب مسافر زبردستی اتار دیئے گئے۔

شام کو ایک وسیع میدان میں ماتمی جلسہ ہوا شہر کے سب ہنگامہ پسند جمع تھے خوانچہ فروش اور پان بیڑی والے چل پھر کر اپنا سودا بیچ رہے تھے جلسہ گاہ کے عارضی دکانوں کے پاس ایک میلہ لگا ہوا تھا چاٹ کے پکوڑوں اور ابلے ہوئے آلوؤں کی خوب بکری ہو رہی تھی۔

جلسہ گاہ کے اندر اور باہر بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی کھوے سے کھوا چھلتا تھا اس ہجوم میں کئی ایسے آدمی بھی پھر رہے تھے جو یہ معلوم کرنے کی کوشش میں تھے۔ کہ اتنے آدمی کیوں جمع ہو رہے ہیں ایک صاحب گلے میں دوربین لٹکائے ادھر ادھر چکر کاٹ رہے تھے دور سے اتنی بھیڑ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ پہلوانوں کا دنگل ہو رہا ہے۔ وہ ابھی ابھی اپنی نئی دوربین لے کر دوڑے دوڑے آ رہے تھے اور اس کا امتحان لینے کے لئے آ رہے تھے میدان کے آہنی کھمبے کے پاس دو آدمی کھڑے آپس میں بات چیت کر رہے تھے اور ایک نے اپنے ساتھی سے کہا " بھئی یہ مصطفےٰ کمال تو واقعی کوئی بہت بڑا آدمی تھا۔۔۔۔۔۔ میں جو صابن بنانے والا ہوں اس کا نام کمال سوپ رکھوں گا۔ کیا کیسا رہے گا۔"

دوسرے نے جواب دیا۔ " وہ کبھی برا نہیں تھا، جو تم نے پہلے سوچا تھا۔ جناح سوپ ۔۔۔۔۔۔ یہ جناح مسلم لیگ کا سب سے بڑا لیڈر ہے۔

" نہیں نہیں کمال سوپ اچھا رہے گا ۔۔۔۔۔۔ بھائی مصطفےٰ کمال اس سے بڑا آدمی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھا "او چلیں جلسہ شروع ہونے والا ہے" وہ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چل دیئے جلسہ

شروع ہوا۔

آغاز میں نظمیں گائی گئیں جن میں مصطفےٰ کمال کی بڑائی کا ذکر تھا۔ پھر ایک صاحب تقریر کرنے کے لئے اٹھے آپ نے کمال اتاترک کی عظمت بڑے بلند بانگ لفظوں میں بیان کرنا شروع کیں۔ حاضرین جلسہ اس تقریر کو خاموشی سے سنتے رہے جب کبھی مقرر کے یہ الفاظ گونجتے مصطفےٰ کمال نے درہ دانیال سے انگریزوں کو لات مار کر نکال دیا ـــــ یا کمال نے یونانی بھیڑوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا ـــــ تو اسلام زندہ باد کے نعروں سے کانپ کانپ اٹھتا۔

یہ نعرے مقرر کی قوت گویائی کو اور تیز کر دیتے اور وہ زیادہ جوش سے اتاترک کمال کی عظیم الشان شخصیت پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔

مقرر کا ایک ایک لفظ حاضرین جلسہ کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کر رہا تھا۔

جب تک تاریخ میں گیلی پولی کا واقعہ موجود ہے برطانیہ کی گردن ترکی کے سامنے خم رہے گی صرف ترکی ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے برطانوی حکومت کا کامیاب مقابلہ کیا۔ اور صرف مصطفےٰ کمال ہی ایک ایسا مسلمان ہے جس نے غازی صلاح الدین ایوبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی اس نے بہ نوک شمشیر یورپی حمالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا ترکی یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا ـــــ مگر کمال نے اسے صحت اور قوت مرد آہن بنا دیا۔

جب یہ الفاظ جلسہ گاہ میں بلند ہوئے تو انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد کے نعرے پانچ منٹ تک برابر بلند ہوتے رہے۔

اس سے مقرر کا جوش اور بڑھ گیا اس نے اپنی آواز کو اور بلند کر کے کہنا شروع کیا ـــــ کمال کی عظمت مختصر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی اس نے اپنے ملک کے لئے وہ خدمات سر انجام دی ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے کافی وقت چاہیے ـــــ اس نے ٹرکی میں جہالت کا دیوالہ نکالدیا تعلیم عام کر دی تھی نئی روشنی کی شعاعوں کو پھیلایا یہ سب کچھ اس نے تلوار کے زور سے کیا اس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسند ملاؤں نے اس کی مخالفت کی مگر وہ سر بازار پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

اس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی ترک رومی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا چاہی ـــــ مگر یہ آواز ان کے گلے ہی میں دبا دی گئی۔ اس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان میں ہو تو بہت سے ملاؤں نے حکم عدولی کی مگر وہ قتل کر دیئے گئے۔

"یہ کفر بکتا ہے ـــــ" جلسہ گاہ میں ایک شخص کی آواز بلند ہوئی اور فوراً ہی سب لوگ مضطرب ہو گئے۔

"یہ کافر ہے جھوٹ بولتا ہے۔" کے نعروں میں مقرر کی آواز گم ہو گئی پیشتر اس کے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا۔ اور وہ چکرا کر اسٹیج پر گر پڑا جلسہ میں بھگدڑ مچ گئی۔

اسٹیج پر مقرر کا ایک دوست اس کے ماتھے پر سے خون پونچھ

رہا تھا ——— اور جلسہ گاہ ان نعروں سے گونج رہی تھی۔

مصطفےٰ کمال زندہ باد —!

مصطفےٰ کمال زندہ باد —!

مصطفےٰ کمال زندہ باد —!

قبض

نئے لکھے ہوئے مکالمے کا کاغذ میرے ہاتھ میں تھا ایکٹر اور ڈائریکٹر کیمرے کے پاس سامنے کھڑے تھے شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی اس لئے کہ اسٹوڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ ابھی چل رہا تھا۔ ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا کیونکہ شوٹنگ کے دوران میں ایکا ایکی جب اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی تو کئی ہزار فٹ فلم کا ٹکڑا بے کار ہو جاتا اور ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔

ڈائرکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کھڑے کیمرے کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور میں سستانے کی خاطر کرسی پر ٹانگیں سمیٹ کر پڑا تھا نہ یوں کہ میری دونوں ٹانگیں کرسی کی نشست پر تھیں اور میرا بوجھ نشست کی بجائے ان پر تھا۔ میری اس عادت پر بہت لوگوں کو اعتراض ہے۔ مگر

یہ واقعہ ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔

نیناجس کی دو آنکھیں بھینگی تھیں ڈائرکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ صاحب بولتا ہے کہ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے پھر شور بند ہو جائے گا۔

یہ روزمرہ کی بات تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک کارخانے میں صابن کٹتے اور پھٹے لگتے رہیں گے چنانچہ ڈائرکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن سمیت اسٹوڈیو سے باہر چلے گئے میں وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔

سقفی لیمپ کی ناکافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں تھیں ان کا درمیانی فاصلہ اصلی فاصلے پر کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا اور گیرو رنگ کے کھری پلائی ووڈ کے تختے جو دیواروں کی صورت میں کھڑے تھے پست قد دکھائی دیتے تھے میں اس تبدیلی پر غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی السلام علیکم میں نے جواب دیا وعلیکم السلام اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی میری آنکھوں میں "تم کون ہو" کا سوال تیرنے لگا۔ آدمی ہوشیار تھا فوراً کہنے لگا۔ جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہوا ہوں —— میرا نام عبدالرحمٰن ہے خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہوں —— آپ کا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے۔

"میں نے کہا جی نہیں —— میں پنجاب کا باشندہ ہوں ——"

عبدالرحمٰن نے جیب سے عینک نکالی معاف فرمایئے گا چونکہ ڈائرکٹر صاحب نے عینک اتار دینے کا حکم دیا تھا اس لئے ——

اس دوران میں اس نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکائی اور

میری طرف پسندیدہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ واللہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ دہلی کے ہیں یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں ـــــ ماشاءاللہ کیا مکالمہ لکھا ہے ـــــ قلم توڑ دیا ہے واللہ ـــــ یہ اسٹوری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے۔

عبدالرحمٰن نے جب یہ باتیں کیں تو اس کا قد بھی میری نظر میں تھری پلائی وڈ کے تختوں کی طرح پست ہو گیا رو کھے پن سے کہا۔ "جی نہیں۔"

نہ اور زیادہ لچکیلا ہو گیا عجیب زمانہ ہے صاحب جو اہلیتوں کے مالک ہیں ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ـــــ یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا عجب اوٹ پٹانگ زبان بولتے ہیں یہاں کے لوگ۔ پندرہ دن مجھے یہاں آئے ہوئے ہو گئے ہیں مگر کیا عرض دل سخت پریشان ہو گیا ہوں آج آپ سے ملاقات ہو گئی ـــــ اس کے بعد اس نے اپنا ہاتھ مل کر اس روغن کی مروڑیاں بنانا شروع کر دیں جو بہ چہرے پر لگاتے وقت اس کے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔

میں نے جواب میں صرف "جی ہاں کر دیا۔ اور خاموش ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور روداد میں لکھے ہوئے مکالموں پر نظر ثانی شروع کر دی چند غلطیاں جن کو درست کرنے کے لئے اپنا قلم نکالا عبدالرحمان ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا مجھے اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے چنانچہ میں نے پوچھا " فرمایئے

اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا" میں ایک بات عرض کروں گا

"بڑے شوق سے۔"

"آپ اس طرح ٹانگیں اوپر کر کے نہ بیٹھا کریں۔"

"کیوں؟"

اس نے جھک کر کہا بات یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے قبض ہو جایا کرتا ہے۔"

"قبض ۔۔۔۔" میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی قبض کیسے ہو سکتا ہے یہ کہہ کر میرے جی میں آئی کہ اس سے کہوں ۔۔ میاں ہوش کی دوا کرو ۔۔۔۔ گھاس تو نہیں کھا گئے۔

مجھے اس طرح بیٹھے بیس برس ہو گئے آج کیا تمہارے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا۔ مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بات بڑھ جائے گی اور مجھے بیکار کی مغز دردی کرنا پڑے گی۔

وہ مسکرایا عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ گیا۔ آپ نے مذاق سمجھا ہے حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ ٹانگیں جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے میں نے تو اپنی ناچیز رائے پیش کی ہے مانئے نہ مانئے یہ آپ کو اختیار ہے۔

میں عجیب مشکل میں پھنس گیا۔ اس کو اب میں کیا جواب دیتا ۔۔۔ قبض آج اس مسخرے کے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا۔ قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے۔ بیس برس کے دوران نہ قبض ہوا۔ قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر نہ بیٹھنے سے جس طرح میں کرسی پر بیٹھتا ہوں، اس

سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے۔ دوسروں کو نہ سہی لیکن مجھے تو اس سے آرام ملتا ہے اور یہ سچی بات ہے کہ مجھے ٹانگیں جوڑ کر سینے کے ساتھ لگا دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسٹوڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑے رہنا پڑتا ہے جس سے آدمی تھک جاتا ہے دوسرے نامعلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دور کرتا ہوں کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی چھوڑ نہیں سکتا خواہ قبض کی بجائے مجھے سرسام ہو جاتے۔ یہ ضد نہیں دراصل بات یہ ہے کہ کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا انداز میری عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز مطالبہ ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے میں عرض کر چکا ہوں کہ اکثر لوگوں کو میرے اس طرح بیٹھنے پر اعتراض ہو رہا ہے اس اعتراض کی وجہ میں نے ان لوگوں سے نہ کبھی پوچھی ہے اور نہ کبھی انہوں نے بتائی ہے اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو میں اس معاملے میں دلیل سننے کے لئے بھی تیار نہیں کوئی آدمی بھی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔

جب عبدالرحمن نے مجھ پر نقطہ چینی کی تو میں بھنا گیا اور اس کا یوں شکریہ ادا کیا۔ جیسے کوئی یہ کہے۔ "لعنت ہو تم پر ——"

اس شکریہ کی رسید کے طور پر اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر پتلی سی مسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا اتنے میں ڈائرکٹر ہیرو اور ہیروئن آ گئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے عبدالرحمن کے قبض سے نجات مل گئی۔

اس کی پہلی ملاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں

۱:۔ یہ ایکٹر جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغل خور ہے۔

۲:۔ یہ ایکٹر جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔

۳:۔ یہ ایکٹر جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پرلے درجے کا مغز چاٹ ہے۔

۴۔ یہ ایکٹر جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس پر بے حد نفرت ہو گئی ہے۔

اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے اس کی زندگی کچھ عرصہ کے لئے زیادہ متحرک ہو جائے گی میں نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں۔ آپ پوچھیں گے کہ نفرت کرنے میں مہارت کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ ہر کام کرنے کے لئے اس خاص سلیقے کی ضرورت ہے اور نفرت میں چونکہ شدّت زیادہ ہے۔ اس لئے اس کے عامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے۔ محبت ایک عام چیز ہے حضرت آدم سے لے کر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں مگر نفرت بہت کم لوگوں نے کی ہے۔ اور جنہوں نے کی ہے ان میں سے اکثر کو سلیقہ نہیں آیا۔ نفرت محبت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف ہے محبت میں مٹھاس ہے۔ اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے مگر نفرت میں ایک ایسی ترشی ہے۔ جو دل کا اقوام بالکل درست رکھتی ہے۔

میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نفرت اس طریقے سے کرنی چاہیئے۔ کہ اس میں محبت کا مزا ملے۔ شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے مجھے اس سے سو فیصدی اتفاق ہے۔ یہ ایک ایسی نفرت ہے۔ جو شیطان کے خلاف نہیں اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی موجود ہے۔ تو وہ یقیناً اس نفرت سے جو کہ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے خوش ہوتی ہوگی اور سچ پوچھیئے تو یہ عالم گیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے اگر ہمیں اس سے نہایت ہی بھونڈے طریقے پر نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے تو دنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصور سے خالی ہوتی۔

میں نے عبدالرحمان سے نفرت کرنا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری اور اس کی دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہوگئی۔ اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو کے باہر جہاں کہیں اس سے میری ملاقات ہوئی میں اس کی خیریت دریافت کرتا اور دیر تک باتیں کرتا رہتا۔

عبدالرحمان کا قد متوسط ہے اور بدن گٹھا ہوا جب وہ نیکر پہن کر آتا تو اس کی بے بال پنڈلیوں کا گوشت فٹ بال کے نئے کورے چمڑے کی طرح چمکتا ہے۔ ناک موٹی جس کی کوٹھڑی ابھری ہوئی ہے چہرے کے خطوط منگولی ہیں ماتھا چوڑا جس پر گہرے زخم کا نشان ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ شیطان لڑکے نے اپنے ڈیسک کی لکڑی میں چاقو سے چھوٹا سا گڑھا بنا دیا ہے۔ پیٹ سخت اور ابھرا ہوا ـــــ حافظ قرآن

ہے چنانچہ۔ بات بات پر آیتوں کے حوالے دیتا ہے دوسرے ایکٹر اس کی عادت کو پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کہ انہیں احترام کے باعث چپ ہو جانا پڑتا ہے۔

ڈائرکٹر صاحب کو جو میری زبانی معلوم ہوا کہ عبدالرحمان صاف زبان بولتا ہے اور غلطی نہیں کرتا تو انہوں نے اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا ایک ہی فلم میں اسے دس مختلف آدمیوں کے بھیس میں لایا گیا سفید پوشاک پہنا کر اسے ہوٹل میں بیرا بنا کر کھڑا کر دیا گیا سر پر لمبے لمبے بال لگا کر اور چمٹا ہاتھ میں دے کر ایک جگہ اس کو سادھو بنایا گیا پیرڑای کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے چہرے پر گوند سے لمبی داڑھی چپکا دی گئی ریلوے پلیٹ فارم پر بڑی بڑی مونچھیں لگا کر اس کو ٹکٹ چیکر بنا دیا گیا۔

یہ سب میری بدولت ہوا۔۔۔۔ اس لئے کہ مجھے اس سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

عبدالرحمان خوش تھا کہ وہ چند ہی دنوں میں اتنا مقبول ہو گیا۔ اور میں خوش تھا کہ دوسرے ایکٹر اس سے حسد کرنے لگے ہیں میں نے خود دیکھ کر سیٹھ سے سفارش کی چنانچہ تیسرے مہینے اس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ بھی ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے پچیس ایکٹروں کی آنکھوں میں وہ خار بن کر کھٹکنے لگا۔

لطف یہ کہ عبدالرحمان کو اس بات کی مطلق خبر نہ تھی کہ میری وجہ سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے اور میری سفارشوں کے باعث کمپنی

کے دوسرے ڈائرکٹر اس سے کام لینے لگے ہیں۔

فلم کمپنی میں کام کرنے کے علاوہ وہاں کے ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کو ایڈٹ کرتا ہوں ایک روز میں نے اپنے اخبار کو عبدالرحمان کے ہاتھ میں دیکھا جب وہ میرے قریب آیا تو مسکرا کر اس نے پرچے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ منشی صاحب ـــــ یہ رسالہ آپ ہی ـــــ"

میں نے فوراً جواب دیا " جی ہاں ـــ"

ماشاءاللہ۔ کتنا خوبصورت پرچہ نکالتے ہیں آپ کل رات اتفاق سے یہ میرے ہاتھ آ گیا ـــــ بہت دلچسپ ہے۔ اب میں ہر ہفتے خریدا کروں گا ـــ"

یہ اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا چنانچہ بات ختم ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جب کہ میں اسٹوڈیو کے باہر نیم کے پیڑ تلے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا اپنے اخبار کے لئے ایک کالم لکھ رہا تھا عبدالرحمان آیا اور بڑے ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا میں نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا فرمایئے "آپ فارغ ہو جائیں گے تو میں ـــــ"

"میں فارغ ہوں ـــ فرمایئے آپ کو کیا کہنا ہے ـــ"

اس کے جواب میں اس نے ایک رنگین لفافہ کھولا اور اپنی تصویر میری طرف بڑھا دی تصویر ہاتھ میں لیتے ہی جب میری نظر اس پر پڑی تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی یہ ہنسی چونکہ بے اختیار آئی تھی اس لئے میں اسے روک نہ سکا

بعد میں مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ عبدالرحمان کو یہ ناگوار معلوم ہوگی تو میں نے کہا۔ عبدالرحمان صاحب اتفاق دیکھئے میں صبح سے پریشان تھا کہ ٹائیٹل پیج کے بعد کا صفحہ کیسے پُر ہوگا۔ دو تصویروں کے بلاک مل گئے تھے مگر ایک کی کمی تھی ـــــ اس وقت بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ نے اپنا فوٹو میری طرف بڑھا دیا ـــــ بہت اچھا فوٹو ہے بلاک بھی اس کا خوب بنے گا ـــــ"

عبدالرحمان نے اپنے موٹے ہونٹ اندر کی طرف سکیڑ لئے "آپ کی بڑی عنایت ہے ـــــ تو ـــــ کیا یہ تصویر چھپ جائے گی ـــــ"

میں نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ کیوں نہیں اس ہفتے ہی کے لئے تو میں یہ کہہ رہا تھا۔

اس پر عبدالرحمان نے دوبارہ شکریہ ادا کیا پرچہ میں تصویر کے ساتھ ایک دوسرا سا نوٹ بھی نکل جائے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا۔ جیسا آپ مناسب خیال فرمادیں ـــــ تو ـــــ معاف کیجئے میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں ـــــ"

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ ہلاتا چلا گیا۔

میں نے اب تصویر کو غور سے دیکھا آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی ایک ہاتھ میں بھاری بھرکم ڈائری تھی جس پر چھپے ہوئے حروف تھے۔ جو بتا رہے تھے کہ سن سولہ کی یہ کتاب فوٹو گرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لئے ایک یا دو آنے میں خریدی ہوگی۔ دوسرے ہاتھ میں جو اوپر کو اٹھا ہوا تھا

ایک بہت بڑا پاپ تھا۔ اس پاپ کی ٹونٹی عبد الرحمان نے اس انداز سے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تھی معلوم ہوتا تھا کہ چائے کا پیالہ پکڑے ہے لبوں پر چائے کا گھونٹ بھرتے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا کرتا ہے وہ تصویر میں اس کے ہونٹوں پر جما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں کیمرے کی طرف دیکھنے کے باعث کھل گئی تھیں ناک کے نتھنے تھوڑے پھول گئے تھے۔ بینے میں ابھار پیدا کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی کیونکہ وہ اچھا خاصہ کارٹون بن گیا تھا یا در ہے کہ عبد الرحمان انگریزی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا ہے۔

میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اس کے فوٹو کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق تعریفی نوٹ کے ساتھ پرچے میں چھپوایا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کمپنی کے غلیظ ریسٹوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبد الرحمان تازہ پرچہ جس میں اس کی تصویر چھپی تھی ہاتھ میں لیئے داخل ہوا اور آداب عرض کر کے میرے پاس کھڑا ہو گیا اسکے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے لیکن میں پرچہ دبا کر اس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے شکریے کے کئی فقرے اس نے دل ہی دل میں بنائے ہوں گے مگر ناموزوں سمجھ کر اس نے منسوخ کر دیئے ہوں گا جب میں نے اسے ادھیڑ بن میں دیکھا تو حاتم پرستی کے انداز میں اس سے کہا تصویر چھپ گئی آپ کی۔ نوٹ بھی پڑھ لیا آپ نے ــــ"

"جی ہاں۔ آپ کی بڑی نوازش ہے۔ ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی میرا رنگ پیلا پڑ گیا یہ درد بہت پرانا ہے۔ جس کے دورے اکثر مجھے پڑتے رہتے ہیں

میں اس کے دفعیے کے لئے سینکڑوں علاج کر چکا ہوں مگر لاحاصل چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اٹھا اور سارے سینے میں پھیل گیا عبدالرحمان نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے "

میں اس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اس موذی مرض کا شکار ہوتے دیکھ سکتا چنانچہ روکھے پن سے کہا۔ کچھ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں "

"جی نہیں آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ سخت گھبرا گیا۔ میں آپ کی خدمت کر سکتا ہوں ۔ "

"میں بالکل ٹھیک ہوں آپ مطلق فکر نہ کریں ۔۔۔ سینے میں معمولی سا درد ہے ابھی ٹھیک ہو جائے گا ۔ "

"سینے میں درد ہے ۔۔۔" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ سینے میں درد ہے تو ۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ آپکو قبض ہے اور قبض ۔۔۔ " قریب تھا کہ میں بھنا کر اس کو دو تین گالیاں سنا دوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ حد کرتے ہیں ۔۔۔ آپ ۔۔۔ سینے کے درد سے قبض کو کیا تعلق ۔۔۔ "

"جی نہیں قبض ہو تو ایک سو ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہوتا ہے آپکی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپکو پرانا قبض ہے اور جناب قبض کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو ۔۔۔ جی نہیں آپ جس کو بافراغت سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ قبض ہو ۔۔۔ سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں قبض سے تو سر میں

درد شروع ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ دراصل آپ کی کمزوری کا باعث بھی یہی قبض ہے۔

عبدالرحمان چند لمحات کے لئے بالکل خاموش ہو گیا لیکن فوراً ہی اس نے اپنے لہجہ میں زیادہ چکناہٹ پیدا کر کے کہا آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہو گا ایک معمولی سا علاج میرا بھی دیکھئے خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دور ہو جائے گا۔"

"میں نے پوچھا کون سا مرض —— ؟"

عبدالرحمان نے زور زور سے ہاتھ ملے —— یہی —— یہی قبض۔"

لاحول ولا قوۃ۔ اس بیوقوف سے کس نے کہا کہ مجھے قبض ہے صرف میرے سینے میں درد ہے جو کہ بہت پرانا اور سب ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے۔ مگر یہ نیم حکیم خطرہ جان برابر کہے جا رہا ہے کہ مجھے قبض ہے قبض ہے۔ قبض ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں غصے میں آ کر اس کے سر پر چائے کا پیالہ دے ماروں عجیب نامعقول آدمی ہے۔ اپنی طبابت کا پٹارہ کھول بیٹھا ہے اور سنتا نہیں

غصہ کے باعث میں خاموش ہو گیا اس خاموشی کا عبدالرحمان نے فائدہ اٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا خدا معلوم اس نے کیا کچھ کہا۔

بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپ کے سدے پڑ گئے ہیں آپ کو ہر روز اجابت تو ہو جاتی ہے مگر سدے باہر نہیں نکلتے معدے کا فعل چونکہ درست نہیں رہا اسلئے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہو گئی ہے رطوبت یعنی لیسدار مادہ جو فضلے کے نیچے پھیلنے میں مدد دیتا ہے آپ کے اندر بہت کم ہو گیا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپ کو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہے۔ قبض کھولنے کے لئے عام طور

پر جو انگریزی مسہل دوائیں بازار میں بکتی ہیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں اس لئے کہ ان سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمائیے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لئے آپکو دو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے۔ یونانی دوائیں اول تو ہم لوگوں کے مزاج کے مطابق ہوتی ہیں۔ دوسرے۔

میں نے تنگ آکر اس سے کہا۔ آپ چائے پیئیں گے" اور ان کا جواب سنے بغیر ہوٹل والے کو آرڈر دیا" گلاب ان کے لئے ایک ڈبل چائے لاؤ۔ چائے فوراً ہی آگئی عبدالرحمن کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کے سین کے متعلق بات چیت کرنا ہے پھر گفتگو ہوگی۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبدالرحمان کی زبان پر منجمد ہوگئی۔ اور ریسٹوران سے باہر نکل گیا۔ درد شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہوگئی تھی ان کی باتوں نے اس تکدر میں اور اضافہ کر دیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیونکر اس بات پر مصر ہے کہ مجھے قبض ہے میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا کہ مدقوق ہوں جیسا کہ عام لوگ میرے متعلق کہتے آئے ہیں کہ سل ہے میری انتڑیوں میں ورم ہے میرے معدے میں ناسور ہے میرے دانت خراب ہیں مجھے گنٹھیا ہے مگر بار بار اس کا اس بات پر زور دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ کہ مجھے قبض ہو رہا ہے یعنی اگر اگر واقعی مجھے قبض تھا تو اس کا احساس مجھے سب سے پہلے ہونا چاہیئے تھا نہ کہ حافظ عبدالرحمان کو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنا رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے

اور تین چار ایکٹریسوں کے ساتھ بہ گئیں الگ رہے تھے آوٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے بلاٹ ملتوی کر دی گئی تھی اس لئے سب کو چھٹی تھی۔

جب مجھے ہیروئن کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گزر گئے تو معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمان کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا ایک ایکٹر نے اس کے خلاف کافی زہر اگلا دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مضحکہ اڑایا تیسرے نے اس کے مکالمے ادا کرنے کی نقل اتاری ہیرو کو حافظ عبدالرحمان کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے۔ ولن نے ڈائرکٹر صاحب سے کہا بڑا واہیات آدمی ہے صاحب ـــ کل ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ میرا ایکٹنگ بڑا فضول ہے۔ آپ اس کو ایک بار ذرا ڈانٹ کر دکھلائیے ڈائرکٹر صاحب ان سے مسکرانے لگے۔ تم سب کو اس کے خلاف شکایت مگر اسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے۔

تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا ـــ "وہ کیا"

ڈائرکٹر صاحب نے پہلی مسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا میں اس کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ مجھے قبض وبض نہیں ہے لیکن وہ مانتا ہی نہیں ابھی تک اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے کئی علاج بھی مجھے بتا چکا ہے میں سمجھتا ہوں وہ اس طرح مجھے ممنون کرنا چاہتا ہے۔

میں نے پوچھا ـــ "وہ کیسے۔"

وہ مجھے ممنون کرنا چاہتا ہے ورنہ پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اسے صرف اسی مرض کا علاج معلوم ہے یعنی اس کے پاس چند ایسی دوائیں موجود ہیں جن سے قبض دور ہو سکتا ہے۔ چونکہ وہ مجھے خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے اس لئے ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ جوں ہی مجھے قبض ہو ——— وہ فوراً علاج کر کے ٹھیک ٹھاک کر دے ——— آدمی دلچسپ ہے ——!

ساری بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب ——— آپ کے علاوہ حافظ صاحب کی نظرِ عنایت خاکسار پر بھی ہے۔ میں نے کل ان کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے۔ اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے ابھی ابھی ہوٹل میں انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ان کے اس حملے سے بچاؤ ہو گیا اس لئے کہ مجھے قبض نہیں ہے۔

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے قبض ہو گیا یہ قبض ابھی تک جاری ہے یعنی اس کو پورے دو مہینے ہو گئے ہیں۔ میں کئی پیٹنٹ دوائیں استعمال کر چکا ہوں مگر ابھی تک اس سے نجات حاصل نہیں ہوئی اب میں سوچتا ہوں کہ حافظ عبدالرحمان کو اپنی خواہش پوری کرنے کا موقعہ دے ہی دوں کیا حرج ہے۔

مجھے اس سے محبت تو ہے ہی نہیں۔

ایکٹرس کی آنکھ

پاپی کی گٹھڑی کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی۔ رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کہ کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کے لئے خاص طور پر تیار کروایا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹرسیں سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کرتے رہتے تھے صوفوں اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی سی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں۔ جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دور کرنے کے لئے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سن کر کسی نووارد کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔

دراز قد ولن جو شکل و صورت سے لاہور کا کوچوان معلوم ہوتا تھا ریشمی سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور وہ بھی نیم وا تھا مگر وہ کراہ رہا تھا اسی طرح اس کے پاس ہی آرام کرسی پر ایک مونچھوں والا ادھیڑ

عمر کا ایکٹر اونگھ رہا تھا کھڑکی کے پاس ڈنڈے سے ٹیک لگائے ایک اور ایکٹر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمپنی کے مکالمہ نویس یعنی منشی صاحب ہونٹوں میں بیڑی دبائے اور ٹانگیں میک اپ ٹیبل پر رکھے شائد وہ گیت بنانے میں مصروف تھے۔ جو انہیں چار بجے سیٹھ صاحب کو دکھانا تھا ——!

اوئی —— اوئی — ہائے — ہائے۔

دفعتاً یہ آواز باہر سے اس چوبی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوئی۔ دلن صاحب جھٹ سے اٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگے مونچھوں والے ایکٹر لمبے لمبے کانوں سے ایک ارتعاش کے ساتھ اس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لئے تیار ہوئے منشی صاحب نے میک اپ ٹیبل پر سے اپنی ٹانگیں اٹھالیں اور دلن صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

اوئی۔ اوئی، اوئی —— ہائے ۔ ہائے۔

اس دفعہ منشی اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک پڑے سب نے کاٹھ کے اس بکس نما کمرے میں سے اپنی گردنیں باہر کو نکالیں۔

"ارے کیا ہے بھئی ——"

"خیر تو ہے ——"

"کیا ہوا —— "

"اماں، یہ تو ـــــ دیوی ہیں۔"

"کیا بات ہے دیوی ـــــ"

جتنے منہ اتنی باتیں ـــــ کھڑکی میں سے نکلی ہوئی گردن بڑے اضطراب کے ساتھ متحرک ہوئی اور ہر ایک کے منہ سے گھبراہٹ میں ہمدردی اور ملے جلے استفسار کے جذبات کا اظہار ہوا۔

"ہائے ہائے ہائے ـــ اوئی ـــ!

"اوئی ـــ!

دیوی کمپنی کی ہر دلعزیز ہیروئن کے چھوٹے سے منہ سے چیخیں نکلیں اور بانہوں کو انتہائی کرب و اضطراب کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اس نے اپنے چپل پہنے پاؤں زور سے اسٹوڈیو کی پتھریلی زمین پر ملتے ہوئے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

چھمّ کا چھمکا۔ بوساقد گول گول گدرایا ہوا ڈیل۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگ خوب خوب کالی بھنویں کھلی پیشانی پر گہرا کسوم کا ٹیکہ ـــــ بال کالے بھنورے سے بیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ کر کنگھی کیے ہوئے تھے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پر بیٹھی ہوئی ہوں ہیں۔

کنارے دار سفید سوتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی چولی گجراتی تراش کی بغیر آستینوں کے جن میں سے جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ ساڑھی بمبئی کی طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف میٹھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا ـــــ گول گول کلائیاں

جن میں کھلی ہوئی جاپانی ریشمیں چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں ان ریشمی چوڑیوں میں کھلی ہوئی ادھر ادھر دلائی سونے کی پتلی پتلی کنگنیاں جھم جھم کر رہی تھیں کان موزوں اور لویں۔ بڑی خوبصورتی کے ساتھ جھکی ہوئی جن میں ہیرے کے آویزے شبنم کی دو تھراتی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔

چیختی چلاتی اور زمین کو چپل پہنے پیروں سے کوٹتی ہوئی دیوی نے اپنی آنکھ کو ننھے سے سفید رومال کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔

"ہائے میری آنکھ ـــــ"

"ہائے میری آنکھ ـــــ ہائے ـــ!"

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گردنیں اندر کو ہو گئیں اور جو باہر تھیں پھر سے ہلنے لگیں۔

"آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔

یہاں کنکر بھی بے شمار ہیں ـــــ ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں۔

"یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے۔

"اندر آ جاؤ ـــ دیوی ـــ

"ہاں ہاں آؤ ـــــ آنکھ کو اس طرح نہ ملو۔

"ارے بابا ـــــ بولا تھا نا تکلیف ہو جائے گی تم اندر آ جاؤ۔"

آنکھ ملتی ملتی دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی دلس نے لپک کر تپائی پر سے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رومال میں چائے کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ کے آئینے میں چھپا دیں اور پرانی پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ

پونچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ بدل ہی جما دیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرانی ادھ جلی بیڑی پھینک کر جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

دیوی اندر آئی صوفے پر سے منشی اور دلن اٹھ کھڑے ہوئے منشی صاحب نے بڑھ کر کہا۔ آؤ دیوی، بیٹھو۔۔۔۔۔۔"

دروازے کے ساتھ بڑی بڑی سیاہ مونچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے ان کی مونچھوں کے ٹھکے اور بڑھے ہوئے بال تھرتھرائے۔ اور انہوں نے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے گجراتی لہجہ میں کہا۔ ادھر بیٹھو۔۔۔۔۔۔"

دیوی ان کی تھرتھراتی ہوئی مونچھوں کی طرف دھیان دیئے بغیر آنکھ ملتی اور ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی۔ ایک نوجوان نے ہیرو جو معلوم ہوتے تھے اور بھینی بھینی قمیض پہنے ہوئے تھے جھٹ سے ایک کرسی نما کرسی سرکا کر آگے بڑھا دی اور دیوی نے اس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔

سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ منشی صاحب کی قوت احساس چونکہ دوسرے مردوں سے زیادہ تھی اسی لئے چشمہ ہٹا کر انہوں نے اپنی آنکھ ملنا شروع بھی کر دی تھی۔

جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی اس نے جھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا۔ اور بڑے متفکرانہ انداز میں کہا۔ آنکھ کی سرخی بتا رہی ہے کہ تکلیف

ضرور ہے۔

ان کا لہجہ پھٹا ہوا تھا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اٹھا یہ کہنا تھا کہ دیوی نے پھر چلانا شروع کر دیا اور سفید ساڑھی میں اس کی ٹانگیں اضطراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔

دلن صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جھکا کر دیوی سے پوچھا —— جلن محسوس ہوتی ہے یا چبھن ——

ایک اور صاحب جو اپنے سولہ ہیٹ سمیت کمرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے۔ آگے بڑھ کر پوچھنے لگے۔ پپوٹوں کے نیچے گرمی محسوس نہیں ہوتی۔

دیوی کی آنکھ سرخ ہو رہی تھی۔ پپوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں جس سے ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دکھتی آنکھ کی پتلی نچاتے ہوئے کہا۔

"اُں —— بڑا تکلیف ہوتی ہے۔ ہائے۔

"اوئی —— اور پھر سے آنکھ کو گیلے رومال سے ملنا شروع کر دیا۔

سیاہ سفید مونچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے بلند آواز میں کہا۔ اس طرح آنکھ نہ رگڑو خانی بیٹی کوئی اور تکلیف نہ ہو جائے۔

ہاں ہاں ارے تم پھر وہی کر رہی ہو —— پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا۔

دلن جو فوراً ہی دیوی کی آنکھ کو ٹھیک حالت پر دیکھنا چاہتے تھے بگڑ کر بولے۔ تم سب بیکار بنا رہے ہو —— کسی سے ابھی تک یہ بھی

نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔ اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مڑ کر کھڑکی سے باہر گردن نکالی اور زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ ارے ـــــ کوئی ہے ـــــ کوئی ہے ـــــ گلاب ـــــ ، گلاب ـــــ !

جب ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی تو انہوں نے گردن اندر کو کر لی۔ اور بڑبڑانا شروع کر دیا۔ خدا جانے ہوٹل والے کا یہ چھوکرا کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ پڑا اونگھ رہا ہے۔ اسٹوڈیو میں کسی تختے پر مردود نابکار ـــــ" پھر فوراً ہی وہ اسٹوڈیو کے اس طرف گلاب کو دیکھ کر چلائے۔ جو انگلیوں میں چائے کی پیالیاں لٹکائے چلا آ رہا تھا۔ ارے گلاب ـــــ گلاب ـــــ!

گلاب بھاگتا ہوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ان صاحب نے گھبرائے لہجہ میں اس سے کہا دیکھو ـــ ایک گلاس میں پانی لاؤ جلدی سے ـــ بھاگو ـــ!"

گلاب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا یہ دیکھنے کے لئے گڑبڑ کیا ہے۔

اس پر ہیرو صاحب للکارے ارے دیکھتا کیا ہے ـــ"

لانا گلاس میں تھوڑا سا پانی ـــــ بھاگ کے جا ـــــ بھاگ کے جا ـــــ"

گلاب کے سامنے ٹین کے چھت والے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا دیوی کی آنکھ میں چبھن اور بھی بڑھ گئی۔ اور اس کی پیاری لنگڑے کی کیری ایسی ننھی

منی روتے بچے کی طرح کانپنے لگی۔ اور وہ اٹھ کر درد کی شدت سے کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ویتی بٹوے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اس نے اپنی دکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اتنے میں منشی صاحب بولے گلاب سے کہہ دیا ہوتا ——— پانی میں تھوڑی سی برف بھی ڈالتا لائے۔

ہاں ہاں سرد پانی اچھا رہے گا۔ یہ کہہ کر دلی صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلائے گلاب ——— ارے گلاب ——— پانی میں تھوڑی سی برف چھوڑ کے لانا۔

اس دوران میں ہیرو صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے کہنے لگے میں بولتا ہوں کہ یہ رومال کو سانس کی بھاپ سے گرم کرو اور اس سے آنکھ کو سینک دو۔ کیوں دادا۔"

ایک دم ٹھیک رہے گا ——— سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے سر کو اس بات میں بڑے زور سے ہلایا

ہیرو صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیپی کو سانس کے ذریعہ سے اس کے گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ دیپی نے رومال لے لیا اور اسے منہ کے پاس لے جا کر گال پھلا پھلا کر سانس کی گرمی پہنچائی آنکھ کو ٹکور دی۔ مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔"

کچھ آرام آیا۔" سولا ہیٹ والے صاحب نے دریافت کیا۔

دیوی نے روتی آواز میں جواب دیا — نہیں — نہیں

ابھی نہیں نکلا — میں مرگئی۔

اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے کر آگیا ہیرو اور ولن دوڑ کر بڑھے اور دونوں نے مل کر دیوی کی آنکھ میں پانی چوایا۔ جب گلاس کا پانی آنکھ کو غسل دینے میں ختم ہو گیا تو دیوی پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور آنکھ جھپکنے لگی

"کیا افاقہ ہوا —

"اب تکلیف تو نہیں ہے —"

"کنکری نکل گئی ہوگی —"

بس تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔

آنکھ دھل جانے پر پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کے لئے دیوی کی بے چینی رفع کر دی — مگر فوراً ہی پھر سے اس نے درد کے مارے چلانا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے۔ یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔

نو وارد کہنہ سال ہونے کے باوجود چست و چالاک معلوم ہوتے تھے مونچھیں سفید تھیں جو بیڑی کے دھوئیں کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں ان کے کھڑے ہونے کا انداز بتا چکا تھا۔ کہ وہ فوج میں رہ چکے ہیں سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پر ذرا اس طرح ترچھی پہنی ہوئی تھی۔ پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی خاکستری رنگ کا تھا۔ کولہوں اور رانوں کے اوپر سے پتلون میں

بڑے ہوئے جھول اس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے۔ کہ ان کی ٹانگوں پر گوشت بہت کم ہے۔ کالر میں بندھی ہوئی میلی نکٹائی کچھ اس طرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا ان سے روٹھی ہوئی ہو۔ پتلون کا کپڑا گھٹنوں پر کھنچ کر آگے بڑھا دیا تھا۔ جو یہ بتا رہا تھا۔ کہ اس کی بے جان چیز سے بہت بڑا کام لے رہے ہیں۔ گال بڑھاپے کے باعث پچکے ہوئے آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں جو بار بار شانوں کو جنبش دی اور قدم بڑھا کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا ـــــ کنکر پڑ گیا ہے ـــ اور اثبات میں جواب پاکر دیوی کی طرف بڑھے۔ ہیرو اور دولہن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرکے آپ نے کہا ـــ پانی سے آرام نہیں آیا۔۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔۔ رومال ہے کسی کے پاس ؟

نصف درجن رومال ان کے ہاتھ میں دے دیئے گئے۔ بڑے انداز میں آپ نے ان پیش کردہ رومالوں میں سے ایک منتخب کیا۔ اور اس کا کنارہ پکڑ کر دیوی کی آنکھ پر رکھا اور دیوی کی اپنی آنکھ سے ہاتھ اٹھا لینے کا حکم دیا۔

جب دیوی نے ان کے حکم کی تعمیل کی تو انہوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چھوٹا بٹوا نکالا اور اس میں سے چشمہ نکال کر کمال احتیاط سے ناک پر چڑھایا پھر چشمے کے شیشوں میں سے دیوی کی آنکھوں کا دور ہی سے اکڑ کر معائنہ کیا۔ پھر دفعتاً فوٹو گرافی کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں جوڑ دیں۔ اور جب انہوں نے اپنی پتلی انگلیوں سے دیوی کے پپوٹوں کو جدا کرنا چاہا تو ایسا معلوم ہوا کہ فوٹو لیتے وقت پیر سے

کا یقین بند کر رہے تھے۔

دو تین مرتبہ ڈرامائی انداز سے اپنے کھڑے ہو کر رخ بدل کر انہوں نے دیوی کی آنکھ کا معائنہ کیا اور پھر پپوٹے کھول کر بڑی آہستگی سے رومال کا کنارہ ان کے اندر داخل کر دیا ——— حاضرین خاموشی سے اس عمل کو دیکھتے رہے۔

پانچ منٹ تک کمرے میں قبر کی سی خاموشی طاری رہی آنکھ صاف کرنے کے بعد اسی ڈرامائی انداز میں فوٹو گرافر صاحب نے ...... چونکہ بزرگ فوٹو گرافر ہی تھے ——— چشمہ اتار کر چرمی پوٹے میں رکھ کر دیوی سے کہا۔ اب کنکر نکل گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔

دیوی نے آنکھ کے پپوٹوں میں انگلیوں سے چھوا اور ننھا سا آئینہ نکال کر اپنا اطمینان کرنے لگی

کنکر نکل گیا نا ———

اب تو درد محسوس نہیں ہوتا ———

سالا اب نکل گیا ہو گا۔ بہت دکھ دیا ہے۔ اس نے ——— !

دیوی ...... اب طبیعت کیسی ہے ———

یہ شور سن کر فوٹو گرافر صاحب نے کاندھوں کو زور سے جنبش دی اور کہا۔ تم سارا دن کوشش کرتے رہتے مگر کچھ نہ ہوتا ...... ہم نے پچیس برس بھاڑ نہیں جھونکا ——— یہ سب کام جانتا ہے۔

کنکر نکل گیا ہے ——— اب صرف جلن باقی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیوی جو آئینے میں روٹھی صورت بنائے اپنا اطمینان کر رہی تھی ایکا ایکی مسکرائی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی چوبی کمرے میں ترنم تارے بکھر گئے۔

اب آرام ہے......... اب آرام ہے۔ یہ کہہ کر دیوی سیٹھ کی جانب روانہ ہو گئی جو ہوٹل کے پاس اکیلا کھڑا تھا۔ اور سب لوگ دیکھتے رہ گئے ہیرو صاحب صوفے پر بیٹھنے لگے۔ تو منشی صاحب کی زبان نیچے آ گئی آپ گھبرا گئے۔ اب کیا پھر سونے کا ارادہ ہے۔ چلو بیٹھو ــــــ مجھے کل والے سین کے ڈائیلاگ سناؤ۔

ہیرو کے دماغ میں اس وقت کوئی اور سین تھا۔

———————

نامکمل تحریر

میں جب کبھی ذیل کا واقعہ یاد کرتا ہوں میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔

ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ جس کے باعث موسم خنک ہو گیا تھا جب میں صبح سویرے غسل خانے کے ہوٹل سے باہر نکلا تو دھلی ہوئی پہاڑیوں اور نہلائے ہوئے ہرے بھرے پیڑوں کی تازگی دیکھ کر طبیعت پر وہی کیفیت پیدا ہوئی جو خوبصورت کنواریوں کے جھرمٹ میں بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بارش بند تھی البتہ ننھی ننھی پھوار پڑ رہی تھی پہاڑوں کے اونچے اونچے درختوں پر آوارہ بدلیاں اونگھ رہی تھیں، گویا رات بھر برسنے کے بعد تھک گئی ہوں۔

میں چشمے کی طرف روانہ ہوا کاندھے پر تولیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں صابن دانی تھی۔ دوسرے میں نیکر جب سڑک کا موڑ طے کرنے لگا۔ تو آنکھوں کے سامنے

دھند ہی دھند نظر آئی۔ بادل کا ایک بھولا بھٹکا ٹکڑا تھا جو شاید آسمانی فضا سے الگ ہو کر ادھر آ نکلا تھا اس بادل نے سڑک کے دوسرے حصے کو آنکھوں سے بالکل اوجھل کر دیا تھا۔ میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا ــــ وہاں بھی سفیدی ہی نظر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ اوپر سے کوئی دھکی ہوئی روئی بکھیر رہا ہے۔

اتنے میں ہوا کے تیز جھونکوں نے اس سپیدی میں ارتعاش پیدا کیا اور اس دھند میں سے دور شاں بخارات علیحدہ ہونے لگے ــ اور میری ننگی باہوں سے مس ہوتے ہوئے برف سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی سردی کے احساس سے وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جو ان بخارات نے پیدا کی۔

اس بادل میں سے گزرتے وقت سانس کے ذریعہ سے یہ سپید سپید بخارات میرے اندر داخل ہو گئے جس سے پھیپھڑوں کو بڑی راحت محسوس ہوئی میں نے جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا۔ جب بادل کے اس ٹکڑے کو طے کر کے میں باہر آیا تو پھر ایکا ایکی مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔ اور جب میں نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو وہ شبنم آلود تکیے کی طرح گیلے ہو رہے تھے۔

میں غسل کے معاملے میں بہت سست ہوں اور سردیوں کے موسم میں تو روزانہ غسل کا میں بالکل قائل نہیں ہوں ــــ در اصل نہانے دھونے کا فلسفہ میری سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا ہے۔ غسل کا مطلب یہ ہے کہ غلاظت دور ہو جائے اور روزانہ نہانے کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی رات میں غلیظ اور گندہ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ منہ دھو لیا جائے۔ پیر صاف کر لئے جائیں ــــ سر کے بال دھو لئے جائیں ــــ اس لئے یہ سب چیزیں جلدی میلی ہو سکتی ہیں

کہ ہر روز بدن کیوں صاف کیا جائے۔ جب کہ یہ بہت دیر کے بعد میلا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو میں خیر نہانے کا مطلب سمجھ سکتا ہوں۔ مگر سردیوں میں اس کا مصرف مجھے نظر نہیں آتا —— آخر کیا مصیبت پڑی ہے۔ کہ ہر روز صبح سویرے انسان غسل خانے میں جائے۔ سردی کے مارے پورے دو گھنٹے تک دانت بجتے رہیں انگلیاں سن ہو جائیں اور ناک برف کی ڈلی بن جائے...... غسل نہ ہوا اچھی خاصی مصیبت ہوتی۔

غسل کے بارے میں اب بھی میرا یہی خیال ہے۔ لیکن جن پہاڑی گاؤں کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہاں کی فضا ہی کچھ اس قسم کی تھی کہ جو چیزیں مجھے اب مہمل نظر آتی ہے۔ یا اس سے پہلے نظر آیا کرتی تھی۔ وہاں بے معنی دکھائی دیتی تھیں —— اسی غسل کو ہی لیجئے جس پہاڑی گاؤں میں جتنا عرصہ میں رہا ہر روز میرا کام پہلا یہ ہوتا تھا کہ نہاؤں دیر تک نہاتا رہوں۔

چشمے پر پہنچ کر میں نے کپڑے اتارے نیکر پہنی اور جب پانی کی اس گرتی ہوئی دھار کے پاس گیا جو پتھروں پر گر کر ننھے ننھے چھینٹے اڑا رہی تھی تو پانی کی ایک سرد بوند میری پیٹھ پر آ پڑی میں تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا جہاں بوند گری تھی اس جگہ گدگدی پرکار کی نوک کی طرح چبھی اور سارے جسم پر پھیل گئی۔ میں کانپا اور سوچنے لگا۔ مجھے واقعی نہانا چاہیئے یا نہیں قریب تھا کہ میں باہر ہو جاؤں لیکن آس پاس نظر دوڑائی تو ہر شے نہاتی ہوئی نظر آئی۔

چنانچہ جو باغیانہ خیال میرے دماغ میں اس شریر بوند نے پیدا کئے تھے ٹھنڈے

میں جی کڑا کر کے نیچے بیٹھ گیا۔ تو لطف آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ دونوں ہاتھوں کے ساتھ زور زور سے پانی کے چھینٹے اڑانے سے سردی کی شدت کم ہو جاتی ہے چنانچہ جب میں نے یہ گر معلوم کر لیا تو پھر اس لطف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

سرد پانی کی موٹی دھار نے عجیب کیفیت پیدا کر دی — پھر جب پانی کے دبائے بال پیشانی پر سے نیچے لٹک آئے اور انہوں نے آنکھوں اور منہ میں گھسنا شروع کر دیا۔ تو زور زور سے پھونکیں مار کر ان کا ناکام ہٹانے کی ناکام سی نے مزا اور بھی دوبالا کر دیا۔ کبھی کبھی ڈوب کر ابھرتے ہوئے آدمی کا احساس بھی آتا ہے۔ چشمے کا پانی آنسوؤں کی طرح شفاف تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ارد گرد بلبلوں اور پانی کے چھینٹوں کا مشاعرہ ہو رہا ہے۔

غسل سے فارغ ہو کر میں نے تولیے سے بدن پونچھا اور سردی کا احساس کم کرنے کے لئے دھیمے سروں میں ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا کبھی یہ سریلی گنگناہٹ ہوا کے جھونکوں سے مرتعش ہو جاتی اور میں سمجھتا میرے بجائے کوئی اور آدمی بہت دور گا رہا ہے۔ اس پر میں تولیے کو زیادہ زور کے ساتھ بدن پر ملنے لگا۔ بدن خشک ہو گیا۔ تو میں نے کپڑے پہنے اس اثنا میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا میرے عین اوپر بادل کا ایک ٹکڑا اسفنج نما چھتری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پہاڑی پر سے اترنا شروع کیا۔ اور فوراً ہی کودتا پھاندتا سڑک میں اتر آیا۔

متوقع بارش سے بچنے کے لئے میں نے قدم تیز کر دیئے لیکن ابھی سڑک پر بمشکل ایک جریب کا فاصلہ ہی طے کرنے پایا تھا کہ اسے

میرے جی میں آئی کہ میں بھی اس آواز کو گیند کی طرح دبوچ لوں اور ہمیشہ کے لئے اپنی جیب میں ڈال لوں۔

میں ٹھہر گیا وہی مانوس دل صدا تھی۔ جو اس سے قبل میں کئی مرتبہ سن چکا تھا بظاہر اے بکری بکری تین معمولی لفظ ہیں اور اکا غذ پر کوئی ایسا تصور پیش نہیں کرتے جو انوکھا حسین ہو مگر واقعی میرے لئے ان میں وہ سب کچھ تھا جو روح کو مسرور کر سکتا ہے۔ جوں ہی یہ آواز میری سماعت سے مس ہوتی تو مجھے یہ معلوم تھا کہ پہاڑ کی چھاتی میں سے صدیوں کی رکی رکی ہوئی آواز نکلی ہے اور آسمان تک پہنچ گئی ہے۔

اے بالکل وہی آواز ہیں اور بکری بکری بلند اور ملک رس سروں میں ایک لمحہ کے لئے یہ نعرہ شباب پہاڑوں کی سنگین دیواروں میں گونجتا۔ ڈوبتا ابھرتا۔ تھرتھراتا اور رباب کے تاروں کی طرح آخری لرزش کی طرح کانپتا فضا میں گھل مل جاتا کالی کالی بدلیاں چھا رہی تھیں فضا نم آلود تھی۔ ہوا کے جھونکوں نے نمی میں غنودگی سی کیفیت پیدا کر دی تھی ہوا کے اوپر میں نے پہاڑی پر اگی ہوئی ہری ہری جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ اور ان کے عقب میں مجھے دو تین بکریاں نظر آئیں میں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا ایک منہ زور بکری وزیر کو گھسیٹے لئے جا رہی تھی۔ اور وہ اس کو ڈانٹ بتلانے کے لئے اے بکری بکری پکار رہی تھی۔ اس کا منہ غصہ اور زور لگانے کے باعث پگھلتے ہوئے تانبے کی رنگت اختیار کر گیا۔ بکری کے گلے میں بندھا ہوئی رسی کو پوری طاقت سے کھینچنے میں اس کا سینہ غیر معمولی طور پر عریاں ہو گیا تھا۔ سر پیچھے جھکا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ آگے

بڑھتے ہوئے سر پر سے دوپٹہ اتر کر بانہوں میں چلا آیا تھا۔ پیشانی پر سیاہ بالوں کی لٹیں بل کھاتی ہوئی سپنولیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

ایک سبز جھاڑی کے پاس جا کر بکری دفعتاً ٹھہر گئی۔ اور اس کے نرم نرم پتوں کو اپنی تھوتھنی سے سونگھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر وزیرے نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنا اترا ہوا دوپٹہ ایک بڑے سے پتھر پر رکھ کر اس نے پاس والے درخت کے تنے سے بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسی باندھی اور دوسرے پیڑ کی جھکی ہوئی ٹہنی پکڑ کر جھولا جھولنے لگی۔

میں جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا تھا بازو اوپر اٹھانے کے باعث اس کی کھلی آستینیں نیچے ڈھلک آئیں کپڑے کے چھلکے سے جب اترے تو اس کے بازو کندھوں تک عریاں ہو گئے۔ بڑی خوبصورت بانہیں تھیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کے دو بڑے دانت اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں بے داغ ہموار زندگی سے بھرپور وہ جھولا جھول رہی تھی۔ اور اس کے دونوں بازو کچھ اس انداز سے اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے کہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ آسمان کی طرف پرواز کر جائے گی جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر میں اس کے سامنے آ گیا دفعتاً اس نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں سہم گئی ٹہنی کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا گری سنبھلی ——— حلق میں سے ایک مدھم سی چیخ نکالتی دوڑ کر دوپٹہ لینے کے لئے پتھر کی طرف بڑھی ...... مگر دوپٹہ میری بغل میں تھا

اس نے دوپٹہ کی تلاش میں یہ جانتے بوجھتے کہ وہ میری بغل میں ہے ادھر ادھر دیکھا اور مسکرا دی اس کی آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے ابھر آئے گال اور

سرخ ہو گئے اور وہ سمٹنے کی کوشش کرنے لگی دونوں بازوؤں کی مدد سے اس نے اپنے سینے کی خوشیوں کو چھپا لیا اور انہیں اور زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی وہ پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور اس پر جب اسے اطمینان نہ ہوا تو اس نے گھٹنے اوپر کر لئے مجھ سے بگڑ کر کہنے لگی۔

یہ آپ کیا کر رہے ہیں — میرا دوپٹہ لائیے — !"

میں بڑھا اور بغل میں سے دوپٹہ نکال کر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا مجھے اس کے بیٹھنے کا انداز بہت پسند آیا۔ چنانچہ میں بھی اسی طرح کے پاس بیٹھ گیا اس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وزیر جوان آرزوں کا ایک بہت بڑا بنا ہے۔ . . . . اور میں . . . . . اور میں نہ معلوم کیا ہوں اکو ہاتھ لگا دوں کہ وہ باجے کی طرح بجنا شروع ہو جائے گی اور ایسے سر اس میں سے نکلیں گے — جو مجھے بہت اوپر لے جائیں گے اور زمین و آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق کر دیں گے۔ جہاں میں کوئی آواز سن سکوں گا۔

وزیر نے مجھے جنگلی بلی کی طرح گھور کر دیکھا گویا کہنا چاہتی ہے اب جاؤ یہاں دھرنا دے کر کیوں بیٹھ گئے ہو۔ میں نے اس کے اس خاموش حکم کی کوئی پرواہ نہ کی اور کہا۔

چشمے سے واپس آ رہا تھا۔ کہ تمہاری آواز سنی بے اختیار کھینچا چلا آیا۔

وزیر . . . . تمہاری یہ آواز مجھے یقیناً پاگل بنا دے گی جانتی ہو پاگل آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

آواز کسی کو کیوں پاگل بنانے لگی۔

"میں نے کہا جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو ـــــ دنیا میں یہ راگ راگنیاں کہاں سے آئی ہیں ـــــ لیکن چھوڑو اس قصے کو بتاؤ ـــــ میری ایک بات مانو گی ـــــ!

مان لوں گی پر آپ تو کہیئے کہ بات کیا ہے۔

ایک دفعہ میری خاطر اے بکری بکری کا نعرہ بلند کرو۔

مجھے ہاتھ سے دھکا دے کر اس نے تیز لہجے میں کہا۔ یہ کیا پاگل پن ہے بنانے کے لئے صرف میں ہی ایک رہ گئی ہوں۔

وزیر بخدا میں تمہیں بنا نہیں رہا ـــــ مجھے تمہاری آواز پسند ہے جھوٹ کیوں کہوں ـــــ اب مان بھی جاؤ بس ایک بار۔

"جی نہیں ـــــ"

"میں تم سے التجا کرتا ہوں ـــــ"

"میں نے یہ آواز نہ کبھی نکالی ہے اور نہ اب نکالوں گی ـــــ"

میں ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں۔

یا اللہ ـــــ یہ کیا مصیبت ہے۔ وزیر نے اپنا بدن سکیڑ لیا اور اگر میں نہ مانوں تو ـــــ یعنی یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میں اس وقت آپ کے کہنے پر بیکار چلانا شروع کر دوں آپ تو خواہ مخواہ چھیڑ خانی کر رہے ہیں اور میں نگوڑی نہ جانے کیا سمجھ رہی ہوں ـــــ بھئی ہو گا ـــــ مذاق اچھا نہیں لگتا۔

میرے چہرے سے تم اس بات کا اطمینان کر سکتی ہو کہ میں ہنسی مذاق نہیں کر رہا ہوں
اس نے میرے چہرے کی طرف مصنوعی غور سے دیکھا اور میری ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔ آپ کی ناک پر یہ ننھا سا تل کتنا بھلا دکھائی دیتا ہے۔

اس وقت میرے جی میں آئی کہ اس پتھر پر جس پر وہ بیٹھی ہے میں اپنی ناک گھسانا شروع کر دوں تاکہ وہ ننھا سا تل ہمیشہ کے لئے مٹ جائے۔ وزیر نے میری طرف دیکھا تو وہ یہ سمجھی کہ میں روٹھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

چنانچہ اس نے فوراً اپنی بکریوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا بابا۔ اب آپ خفا نہ ہو جائیے۔"

قریب تھا کہ وہ اپنی مخصوص آواز بلند کرے کہ ایکا ایکی جھجک اس پر غالب آ گئی۔ بہت زیادہ شرما کر اس نے اپنی گردن جھکا لی اور کہا۔ پر میں پوچھتی ہوں کہ اس میں خاص بات ہی کیا ہے۔

میں نے بگڑ کر کہا۔ وزیر تم باتیں نہ بناؤ۔"

دوسری طرف منہ کر کے اس نے ایکا ایکی بلند آواز میں اسے بکری پکارا اس کے بعد شرمیلی ہنسی کا ایک فوارہ سا اس کے منہ سے چھوٹ پڑا جو بلندیوں میں پرواز کر گیا۔ کتنی صاف اور شفاف آواز تھی ــــــــ دھلی ہوئی فضا میں اس کی گونج دیر تک دور تک سے اوجھل ہو جانے والے پرندوں کے پروں کی طرح چمکتی رہی پھر جذب ہو گئی۔

وزیر کی طرف میں نے دیکھا کہ اب وہ خاموش تھی اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر اداس تھا۔ آنکھیں بنائی ہوئی چڑیوں کی طرح بے قرار تھیں اس کے باعث ان

میں آنسو بھر آئے۔ ہونٹ اس انداز سے کھلے ہوئے تھے کہ چہرے ہونٹوں میں سرسراہٹ پیدا ہو گئی ــــ خدا معلوم کیا ہوا ــــ میں نے وزیر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کا سر میری گود میں ڈھلک آیا ــــ لیکن ان کا ایکی زور سے وہ اپنا بازو میرے جھکے ہوئے سر اور متحیر چہرے کے درمیان لے آئی اور دھڑکتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی آہ ہٹائیے ہٹائیے ــــ ان ہونٹوں کو میری گود سے نکل کر وہ بھاگ گئی میرے ہونٹوں کی تحریر نامکمل رہ گئی۔

اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں میں اٹکا رہے گا۔
